بڑی حد تک عام فہم اور دلچسپ بنا دیا ہے، ایک جگہ اپنے بارہ میں لکھا ہے" اور باوجود نہایت مذہبی گھرانے کا فرد ہونے کے صوم وصلوٰۃ کا تارک ہوگیا" ان کے اس ذاتی فعل پر کسی کو شکایت کا چاہے حق نہ ہو، مگر جب وہ مذہب اور اس کے اعمال ومناسک کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ "ان سزاؤں کے علاوہ ایک اور سزا بھی ہے، جس کا تعلق ایک ایسی ذات کے تصور سے ہے جس کی طاقتیں بے پایاں اور جس کا اقتدار زمان ومکان کی بندشوں سے آزاد سمجھا جاتا ہے، جن قوموں، یا جماعتوں پر مذہب کا عمل درآمد باقی ہے ان کے نزدیک سب سے اہم سزائیں اسی عظیم الشان ذات کی نافذ کردہ ہوتی ہیں، یہ سزائیں کبھی تو پاداش گناہ کی صورت میں مادی تکالیف یا آفات ارضی وسماوی کی شکل اختیار کرتی ہوئی اور کبھی دوسری زندگی میں جہنم کی اذیتیں بن کر ظاہر ہوتی ہوتی باور کی جاتی ہیں، اس ذات عظیم پر ایمان رکھنے والے اسے ایک خارجی شخصیت، ماسوائے ذات تصور کرتے ہیں، اور اس طرح ان مذہبی سزاؤں کا سرچشمہ بھی ایک خارجی ذات ہی سمجھی جاتی ہے" (ص ۳) اسی طرح وہ قربانی کی ایذارسانی پر بھی بحث کرتے ہیں، لیکن معلوم نہیں یہ تجزیہ ایک ماہر نفسیات کا ہے یا اس میں ان کا ذاتی عقیدہ بھی شامل ہے، بہرحال ایسی بحث سے مذہب کے استخفاف کا پہلو نکل آتا ہے، جس کی ان جیسے نیک نفس اہل قلم سے توقع نہیں کی جاسکتی، کہیں کہیں تذکیر وتانیث اور املا کی غلطیاں بھی نظر آئیں، جو ممکن ہے کہ کتابت کی ہوں، امید کہ یہ آیندہ اڈیشن میں درست کرلی جائیں گی،

انتخاب ذکاء اللہ: مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، قیمت ۵ روپیے، پتہ: اترپردیش اردو اکاڈمی، ظہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اترپردیش اردو اکاڈمی نے اردو کے اہم نثر نگاروں کی تحریروں کا انتخاب شائع کرنے کا جو مفید پروگرام بنایا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے ۱۴ تحریروں ومضامین پر مشتمل ہے مولوی صاحب کے حالات اور کارنامے بھی خوش مذاقی سے لکھے گئے ہیں۔

"ض"

جون

جلد ۱۳۵ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات

گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے دو اہم واقعات ہوئے، ایک تو ایک مسلمان کے لیے اپنی مطلقہ بیوی کو نان نفقہ دینے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے، دوسرا کلکتہ ہائی کورٹ میں دو ہندوؤں کی طرف سے قرآن مجید کی طباعت و اشاعت پر پابندی لگانے کی درخواست ہے۔

ان دونوں واقعات کی وجہ سے مسلمانوں میں جو ہیجان پیدا ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی دینی دولت سے مالامال ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر عام مسلمانوں کے سوچنے کا یہ سیاسی انداز ہو گیا ہے کہ جب ملک کی تقسیم کا ان کا مطالبہ پورا ہو گیا تو پھر وہ اس ملک میں کسی بڑے سیاسی مطالبہ کا حق نہیں رکھتے، دستور ہند میں ایک عام شہری کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان ہی پر اکتفا کر کے وہ پرامن شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہیں، مگر بعض حلقوں میں مسلمانوں کا وجود ہی گوارا نہیں، اسی لیے ان سے نفرت کا اظہار بلوے فسادات کے ذریعہ سے ہوتا رہتا ہے، پھر ان کے شرعی قوانین اور اب تو قرآن مجید کو بھی نعوذ باللہ دریائے ناپیدا کنار میں غرق کرنے کی کوشش ہے، ایسے حلقوں کے انتہا پسند افراد سے کچھ کہنا نہیں، لیکن ہماری حکومت تو ہمارے حقوق کی بھی پشتیبان اور نگہبان ہے، جب اس کی طرف سے بارہا یقین دہانی کرائی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی، تو سپریم کورٹ کو شوہر کی خوبی بیان کر کے یا کسی ایسے فیصلہ کی حمایت کر کے جس سے صریحاً مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہو ان کے جذبات کو مجروح کرنے کا کیا جواز ہے۔

حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ مسلمان اس سلسلہ میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں کوئی فرقہ پرست اور رجعت پسند مسلمان رہنما نہیں، بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے انتہا درجہ کے سیکولرسٹ اور بے مثال

محب وطن کانگریس ہی کے پلیٹ فارم سے یہ اعلان کر گئے ہیں کہ میں ایک مسلمان ہوں، اور اس خیال سے مجھ کو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات ہیں وہ میری وراثت ہیں، میں اس کو بال برابر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم اسلامی آرٹ اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے اجزا ہیں، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میں تہذیبی اور مذہبی حلقوں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہوں، اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں کوئی مداخلت کرے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ کہا وہ نہ صرف ان کے احساسات ہیں، بلکہ عام مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے، پھر وہ نکاح، طلاق، مطلقہ بیوی کے نان نفقہ کے متعلق کسی ایسے فیصلہ کو کیسے گوارا کر سکتے ہیں، جو ان کے شرعی قوانین کے خلاف ہو، کسی قانون کے بنانے یا کسی کورٹ کے فیصلہ پر عمل کرنے میں حکومت کی نیت کتنی ہی اچھی اور بلند ہو لیکن اس سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہو، تو یہ مداخلت فی الدین سمجھی جائے گی، جو ان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے، حکومت کی حکمرانی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کے شہری خوش اور مطمئن رہیں، لیکن اس کے کسی فیصلہ یا قانون سے آزردگی اور بے چینی پیدا ہو تو کیا یہ اچھی حکمرانی کی دلیل ہوگی۔

کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی گئی کہ قرآن مجید کی طباعت اور اشاعت قانونی طور پر ہندوستان میں روک دی جائے، اس لیے کہ جیسا کہ اخباروں میں شایع ہوا تھا اس میں کفار کے خلاف تشدد کی تعلیم ہے، درخواست دہندے قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے اس کے متعلق جو چاہیں رائے قائم کریں، لیکن اگر ان کو کافر اور کفار کے لفظ سے برہمی ہے تو کافر کم از کم ملیچھ کے مقابلہ میں ہلکا لفظ ہے، کافر کے معنی اللہ کے منکر کے ہیں، ہندو اپنی مورتی پوجا کے باوجود اپنے کو اللہ کا منکر نہیں کہتے ہیں، بلکہ ان کے یہاں تو ایشور کے وجود کا اتنا اونچا تخیل ہے

ہندو عوام اس کو نہیں سمجھ پاتے ہیں تو مورتی پوجا ہی کو اصلی پرارتھنا سمجھتے ہیں، قرآن میں کفار کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مخاطب اگر ہندو اپنے ہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ ان کے احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔

اگر ہندو کھلے ذہن سے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کریں تو وہ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ قرآن مجید میں ایک دین رحمت کا پیام ہے، انسانیت کی تکمیل کے لیے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہے، ان سب کی تعلیم اس میں ہے، ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاکبازی، دیانتداری، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو ودرگذر، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی، استغنا، محبت اور شفقت وغیرہ کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہو سکتی ہیں، وہ اس میں ہیں، جتنے رذائل اخلاق ہیں، ان سب کی مذمت اور ممانعت کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کا رب رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العالمین ہے، اور اس میں اپنے رسولؐ کے ذریعہ جو پیام دیا گیا ہے، اس بنا پر آپ رحمۃ للمسلمین کے بجائے رحمۃ للعٰلمین ہیں، اگر کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرے تو یا تو یہ اس کا مذہبی تعصب ہے یا قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت اس کے بیچ میں حائل ہے، یا وہ غلط رائے قائم کرنے کی منفیانہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔

قرآن کی پہلی سطر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے، اس کی ہر سورہ کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بہت مہربانی کرنیوالا ہے رحم کرنے والا ہے، قرآن مجید میں رحمان کے نام کی تکرار ۵۷ دفعہ کی گئی ہے، پھر بے شمار طریقے سے اپنے کو ستار، غفار، غفور، کریم، ذوالجلال والاکرام کہا ہے، ہاں وہ قہار اور جبار بھی ہے، اسی طرح جس طرح ہماری کیا، دنیا کی ہر حکومت اپنے مجرموں اور غداروں کو پھانسی دیتی ہے، باغیوں، منکروں اور شورش پسندوں کے پورے علاقے کو اپنی پولیس کی گولیوں اور فوج کے توپ و تفنگ سے ہلاک اور برباد کر دیتی ہے،

قرآن مجید میں اللہ کی قہاری کے مقابلہ میں اس کی رحیمی، کریمی، ستاری اور غفاری کی کوئی حد نہیں، قرآن مجید ہی میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا پیام دے کر اس دنیا میں بھیجا تو آپ کو مخاطب کر کے بار بار ارشاد فرمایا: "ہم نے تم کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے" (الانبیاء: ۱۰۷) "اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا، نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے" (احزاب: ۶) "ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد، لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا، اور ہشیار کرنے والا بنا کر" (سبا: ۲۰) "بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل، احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے، تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی کرو، جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے" (قصص: ۷۷) "جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے" (کہف: ۲۹)۔ "دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے" (بقرہ: ۲۵۶) "اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ، اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو" (نحل: ۲۵) "تمہارے ذمہ تو صرف اللہ کا پیام پہونچا دینا ہے" (شوریٰ: ۴۸) "پھر اگر لوگ اعراض کریں تو تمہارے ذمہ تو صاف صاف پہونچانا ہے" (نحل: ۸۲) "تم ان پر مسلط نہیں ہو" (غاشیہ: ۲۲) "اور نہ تم ان پر مختار ہو" (بنی اسرائیل: ۵۴) "ہم نے تم کو ان کا نگراں کر کے نہیں بھیجا ہے" (نساء: ۸۰) ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہیں۔

یہ باتیں تو ان کے لیے ہیں جو افہام و تفہیم اور مہر و محبت کے جویاں ہیں ان کے لیے نہیں

جو آنکھوں کو بند کرکے اور کانوں میں روئی دے کر ایسی باتیں سوچتے ہیں جن سے مخلوقِ خدا کو دھوکہ دیں، اور اپنی خود سرائی اور خود نمائی کا راگ الاپ کر اپنے کو حقیقی اور صادق رہنما سمجھیں۔

ایسے رہنماؤں کو یہ بھی سوچنا ہے کہ ان ہی کی سرزمین میں ایسی مقدس کتاب ہے جس میں اشرف المخلوقات انسان کے ایک بہت بڑے طبقہ کو شودر کہا گیا ہے، ان کے ساتھ ہزاروں برس تک جو نفرت انگیز، اخلاق سوز اور شرمناک سلوک کیا گیا ہے، اس سے انسانیت کی گردن ذلت سے جھکی ہوئی ہے، ان کو ملیچھ کہا گیا، جس کے معنی غلیظ، ناپاک، گھناؤنی اور جن سے لوگوں کو گھن آنے کے ہیں، ان کو کسی عبادت گاہ میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی، ان کے کانوں میں مقدس وید کے کسی اشلوک کی صدا پہونچ جائے تو ان کے کانوں میں سیسہ پلا دینے کا حکم دیا گیا ہے، وید صرف برہمن اور کشتری سیکھ سکتے ہیں، کیونکہ ان ہی کے لیے نجات ہے، کسی اور کے لیے نہیں، ایسی مقدس کتاب کسی ہائی کورٹ میں بحث ہو سکتی ہے؟ پھر ملاپ جیسے اخبار میں ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں یہ تحریر شائع ہوئی تھی کہ گئو ہتیا رے کو سیسے کی گولی سے اڑا دینے کے لیے شاستروں میں آگیا ہے، چاہے گئو گھاتک کوئی گورا ہو یا کالا، اگر یہ صحیح ہے تو کیا ایسے شاستروں کے خلاف بھی کسی ہائی کورٹ میں درخواست دی جا سکتی ہے؟

کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف درخواست دینے والوں کو یہ معلوم رہا ہوگا کہ ان کی درخواست رد کر دی جائے گی، لیکن اس سے تو وہ مسلمانوں کی اہانت چاہتے تھے، ان کی یہ مراد شاید پوری نہیں ہوئی، اس کے بجائے مسلمان اپنے خواب غفلت سے اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ ان کا بڑے سے بڑا رہنما نہیں جھنجھوڑ

سکتا تھا، عدو کے شر میں بعض اوقات خیر کی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس درخواست کے بعد اسلامی ممالک میں قرآن مجید سے بے پناہ احترام کا جذبہ پیدا ہوا، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور ملی وجود کے خطرات کا بھی احساس ہوا، وران کے بقا کی فکر بھی دامن گیر ہوئی، کلکتہ کے مسلمانوں کے ساتھ وہاں کے ہائیکورٹ کے مسلمان وکلاء کی ایمانی حرارت اور مذہبی غیرت پورے طور پر بروے کار آئی، جیسا کہ وہاں کے مشہور اور ممتاز ایڈوکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک ولولہ بھرے مکتوب سے معلوم ہوا، انھوں نے اس درخواست کے خلاف اپنے اور رفقاء کے ساتھ اس کی پیروی کرنے میں سربراہی کی خدمت انجام دی، وہ اور ان کے رفقاء ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درخواست کے رد کرانے میں مغربی بنگال اور مرکز کی حکومتوں نے بڑی فراخ دلی، رواداری اور مآل اندیشی کا ثبوت دیا، جو یقیناً قابل تحسین ہے

جس طرح ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے اس درخواست کو رد کرانے میں رواداری کی پیش قدمی کی، اسی طرح ہماری مرکزی حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا میں عدم مداخلت کر کے اپنی حکمرانی کا صحیح جوہر دکھائے تو پھر اس کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمان ملک کی جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی میں کیسے قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں، کسی ایک عورت یا تھوڑے سے تجدد پسند، مذہب سے بیزار، مفاد پرست، ریاکار اور حکومت کے عہدوں کے طلبگار مسلمانوں کی خاطر مسلمانوں کے سارے سوادِ اعظم کو ناراض اور برگشتہ کرنا رموزِ حکمرانی سے ناآشنا اور بیگانہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

ملک کے مشہور مورخ جدوناتھ سرکار نے اپنی تحریروں میں برابر یہ الزام رکھا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا، ان کے علوم و فنون کو منتشر کیا، ان کے میلوں اور تہواروں کو روک دیا، انھیں ہر لحاظ سے نیچا دکھایا گیا، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا، اورنگ زیب کے ماتحت جو ہندو تھے وہ اپنے علوم و فنون سے بے خبر، مذہبی روایات سے بے گانہ، معاشرتی ارتباط سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کر سکتے تھے، دولت اور خود اعتمادی سے بھی جو موقع اور آزادی کے نتائج تھے، وہ محروم تھے، ان کی زندگی مستقل معاشرتی اور سیاسی مذلت ہو کر رہ گئی تھی۔ (اورنگ زیب، از جدوناتھ سرکار، ج ۵، ص ۴۸۵)

ان واقعات کی برابر تردید کی جا رہی ہے، لیکن عام ہندو اسی کو حقیقت سمجھتے ہیں جو جدوناتھ سرکار لکھ گئے، اگر اس دور میں کوئی مسلمان جدوناتھ سرکار اس قسم کے تمام واقعات قلمبند کر دے جن سے آج کل کے ہندوستانی مسلمانوں کا سامنا ہے تو حکومت ضرور اس کی تردید کرے گی، لیکن جس طرح اورنگ زیب کے زمانہ کے واقعات کی تردید کرنے سے کوئی ہندو مطمئن نہیں ہوتا، اسی طرح آج یا آیندہ کے مسلمان حکومت کی تردید کو صحیح نہ سمجھیں تو کیا وہ مورد الزام قرار دیے جائیں گے؟

مقالات
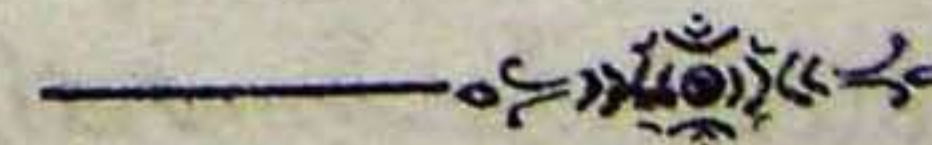
سر سید احمد خان اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۵)

سر ولیم کے خیال میں روایت کے معتبر ہونے کے لیے ایک عجیب قاعدہ

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب کسی روایت میں محمد صاحب کی تحقیر کے کلمات ہوں، مثلاً بعد ہجرت اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کار خیر میں ناکام ہوئے یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں ایجاد کر لی جائیں، یا ایجاد ہو کر محمد صاحب کے متبعین میں رواج پا سکیں۔

مگر سر سید کے خیال میں "درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے۔" وہ فرماتے ہیں کہ کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا، اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں، اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں، یا وہ کسی کی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، اور جن کی نسبت علماء نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں، در اصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں، اختراع کر لی تھیں، اس لیے ان مذکورہ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات بنالی جائیں، یا گھڑ لیے جانے کے بعد تبعین محمد صاحبؐ میں رواج پا سکیں۔" ان کی یہی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں"

(خطبات احمدیہ ص ۳۹۹)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لیے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک کا نام انھوں نے تلون آمیز اختراع رکھا ہے، اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً ان ہی کے بقول "بیس[۲۰] گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحبؐ خضاب کیا کرتے تھے، اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں، بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا، بلکہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا، اور بیس[۲۰] گواہ جن کو واقفیت کے یہی ذرائع حاصل تھے، بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحبؐ نے کبھی خضاب نہیں کیا، اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔" (ایضاً ص ۴۰۰)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ بیانِ واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے، جب کہ معمولی غور و فکر سے اختلاف کی اصل وجہ اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آسکتی ہے؟ چنانچہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے (بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف سترہ[۱۷] بال

سفید تھے) آنحضرتؐ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا، جو لوگ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے، ان کا یہی بیان ہے، اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں اس لیے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں، اور ان ہی بھورے بالوں سے استدلال کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب کرنا بیان کیا، خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے، بلکہ اس چیز کا ذکر ہے جس کو پیغمبر صاحبؐ غسل کے وقت اپنے سر پر مل لیتے تھے، پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورۂ بالا سبب سے، قدرتی طور پر خود بخود ہو گیا، اس کو دیدہ و دانستہ عیارانہ بناوٹ نہیں کہا جا سکتا، ان کو یا اسی قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض یا بناوٹی روایتیں نہیں کہا جا سکتا۔" (خطبات ص ۴۰۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتریِ مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم میور نے یہی طریق استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں خاتم نبوی کے باب میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے جانبداری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے سر ولیم کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے۔ "ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحبؐ نے اپنے استعمال میں مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ خالد بن سعید نے اپنے لیے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی اور محمد صاحبؐ نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا، ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعد حبش سے لائے تھے، چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبلؓ نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں کھدوایا تھا، اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمد صاحبؐ اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے، اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ الٹے ہاتھ میں، بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا اور

بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے، بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر ۔۔۔
"صدق اللہ" نقش تھا، اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "محمد رسول اللہ" نقش
تھا، سر ولیم کے بقول "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ یہ متواتر بیان
کیا گیا ہے کہ محمد صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی زیب انگشت کیا تھا
اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہِ غریس میں گر پڑی تھی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر صاحب یا ان کے
خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی۔ (ایضاً ص ۴۰۲) سر ولیم میور نے روایات میں
تضاد ثابت کر کے جس پُر فریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اس سے
ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے، جس پر سرسید احمد خان یہ تبصرہ کرتے ہیں:

(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے' وہ نہایت افسوس کے قابل ہے'
یہ بیان سر ولیم میور کا کہ "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں" محض غلط ہے'
اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی
انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کیا ہو، یا چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول
والی انگوٹھی علیحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ بن جبلؓ والی انگوٹھی پر "صدق اللہ"
اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ کندہ ہو؟
کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو، اور کبھی الٹے ہاتھ میں، اور کبھی
اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف، اس انگوٹھی کو آنحضرتؐ اور خلفائے
راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے، جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے
بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی، سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک
ہی انگشتری سے متعلق خیال کیا ہے، اس لیے اپنی دلیل میں کسی تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی

انگشتری صحابہ تک پہونچی تھی، حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر "محمد رسول اللہ"
کندہ تھا، پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے
اپنے ذہنی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط مستقیم
سے منحرف ہو گئے، اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک
و شبہہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہو گئے، اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہہ کر
بدنام کرتے ہیں، سر ولیم میور کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے
تھا کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل و ثبوت نہ ہو، ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کا باعث ہوتے
ہیں، جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو۔"

(خطبات احمدیہ ص ۴۰۳)

اسلامی روایات میں عیسائیوں کے "مقدس جھوٹ" کی تلاش،

عیسائیوں کے یہاں مذہبی روایات کا زیادہ تر دار و مدار اس "مقدس جھوٹ"
پر ہے، جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے، اور اس کے کچھ شواہد کا تذکرہ
آئندہ صفحات میں بھی کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں بھی "مقدس
جھوٹ" کی جستجو کی ہے' اور اس بارے میں انھوں نے اسلامی روایات کو ان کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اپنی
مذہبی روایات کے معیار سے قریب تر لانے کی "سعادت" حاصل کی ہے، اگر قواعد تصنیف میں اس قدر
انحراف کو دیکھ کر ہر صحیح الدماغ اور ذی ہوش شخص کو یقینی طور پر ملال ہوگا کہ وہ دین اسلام پر الزام تراشی
کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "مقدس جھوٹ" کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے، دینیات اسلام کی
رو سے بعض حالتوں میں فریب روا ہے، خود پیغمبرؐ صاحب نے اپنے احکام کے ذریعہ اس عقیدہ کی ترغیب
دی ہے، کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔" پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے یہاں عام
عقیدہ یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، کسی شخص کی جان بچانے کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صلح و اتفاق کرانے کیلئے، عورت کی ترغیب کے واسطے اور سفر یا کسی خاص مہم کے موقع پر" سر ولیم ان چار موقعوں کے لیے اپنے خاص انداز میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں "اول کی نسبت تو پیغمبر صاحب کی صریح منظوری موجود ہے۔" وہ لکھتے ہیں کہ "عمارؓ بن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہونچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انھوں نے رہائی پائی، پیغمبرؐ صاحب نے اس فعل کو پسند کیا، اور فرمایا کہ "اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا۔" (واقدی ص ۲۲۷) ایک اور روایت خاندانِ یاسر میں چلی آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا، اور جب تک کہ ان سے محمدؐ صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی، ان کو نہ چھوڑا، جب وہ پیغمبرؐ صاحب کے پاس آئے، اور انھوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی، جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا، پیغمبر صاحب نے پوچھا کہ تمھارے دل کا کیا حال ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے، تب محمدؐ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا، محمد صاحبؐ نے یہ بھی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابو جہل کے سچ سے بہتر ہے۔"

سر ولیم میور کی اس نکتہ چینی کے جواب میں سر سید کو شکسپیر کا یہ قول یاد آگیا کہ "دیکھو کہ ایک سادہ قصہ کس طرح تم کو دھوکہ دیتا ہے۔" اس کے بعد وہ اس "نکتہ چینی" کا تجزیہ کرتے ہیں:

"اول تو ان روایتوں کی جن کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے، دوسرے جن الفاظ میں موصوف نے اس مضمون کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں، سر ولیم اول موقع جھوٹ بولنے کے جواز کا کسی کی جان بچانا بیان کرتے ہیں، اول تو یہی غلط ہے، جو روایتیں انھوں نے بیان کی ہیں، ان کے مطابق ان پر لازم تھا کہ "اپنی جان بچانا لکھتے" اور اس بے دھڑک اور جرأت آمیز بیان کے بجائے سر ولیم کو لازم تھا کہ تمام شرطیں، قیدیں اور مواقع جو "سچ" سے اس طرح انحراف کو جائز ٹھہراتے ہیں واضح کر دیتے، جس فریب دہ اور عیب دار پوشاک میں سر ولیم نے اس مضمون کو

آراستہ کیا ہے، اگر وہ اتار لی جائے تو جائز، منصفانہ دلیل اور صحیح اصول و مقدمات کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ "اگر اہل کفر، بے رحم اور جفاکار لوگ جبر و اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی آدمی سے اس چیز کا انکار کرا لیں جس کو وہ اپنے دل سے، اپنے ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس پر ایسی مصیبت میں بھی وہ یقین رکھتا ہو تو ایسے وقت میں "اپنے انکار" سے وہ سزائے ارتداد کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ (خطبات احمدیہ، ص ۴۰۵)

وہ عہد و پیمان جن کی تکمیل و توثیق ظلم اور جبر کے زور سے کی گئی ہو ان سے انحراف کا جواز سر سید کے الفاظ میں "فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ثابت ہوتا ہے، اس بادشاہ کو چارلس خامس نے جنگ پاویا (۱۵۲۵ء) میں قید کر کے میڈرڈ کے ذلت آمیز صلح نامہ پر بزور منظوری حاصل کر کے دستخط کرا لیے تھے، بادشاہ فرانس نے اس قید سے چھوٹتے ہی زور زبردستی کا عذر ظاہر کر کے اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے انکار کیا، اور پوپ کلیمنٹ سابع نے اس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔"

سر سید ظلم اور جبر سے لیے ہوئے "عہد و پیمان" کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ "آدمی کے افعال میں جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے، اور اسی بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں، کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے اس کو اذیت دے کر اور قتل کی دھمکیوں کے بعد زبانی طور پر یا تحریر کی صورت میں حاصل کر لیے گئے ہوں، اسی قدر سزا کے مستحق ہوں گے جیسے کہ اس آدمی کے کلمات اور حرکات، جو کسی جبر اور زبردستی کے بغیر اس سے سرزد ہوئے ہوں،

سر سید نے اس موقع پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

"یہ اصول جس سے اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے، اور جو محض ایک بے خطا اصول اور قدرتی فطرت کا سچا نمونہ ہے، اور جس کو سر ولیم میور نے قابل اعتراض انداز

اور خراب صورت میں پیش کیا ہے، قرآن مجید میں صاف اور سادہ طریقہ سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا ایمان لے آنے کے بعد۔ سوائے اس آدمی کے جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل، ایمان پر مطمئن ہو۔ اور جس نے کفر سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا، تو ان پر خدا کا غصہ ہے، اور ان پر بڑا عذاب ہے (نحل ۱۰۸) اس آیت پر فقہا نے غور کیا ہے اور دو صورتیں بیان کی ہیں، اول عزیمت کی، یعنی آدمی اہل کفر کی طرف سے اذیتوں، تکلیفوں اور قتل کے خوف کے باوجود ظاہر میں بھی اسی پیچ پر قائم رہے، جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، دوم رخصت کی صورت یعنی ایسی صورت میں اس کو یہ اجازت ہے کہ اس ایمان کا انکار کر دے جس کی تصدیق اس کے دل میں موجود ہے، اور اس طرح وہ دشمنوں کی ایذاء سے اپنے آپ کو بچا لے، یہ عجیب بات ہے کہ اس صاف اور سیدھی بات سے سر ولیم میور نے وہ "مقدس جھوٹ" ثابت کرنا چاہا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا، پھر انھوں نے اپنے مقصد اور مفہوم کے لیے یہ چند الفاظ "کسی کی جان بچانے کے لیے" کافی سمجھے، جو گمراہ کن ہیں، جبکہ قرآن میں بھی جو اپنی فصاحت اور اختصار میں بے مثل ہے اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ایک پوری آیت درکار ہوتی ہے۔ (خطبات ۴۰۷)

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور جس روایت سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے لیے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے، گو وہ کلمات جھوٹ ہوں"، مگر سر سید کے نزدیک:

"یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے، اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اور جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہ اس کو درج کرتے ہیں، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ

"ام کلثوم رضؓ نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فیقول خیرا و ینمی خیرًا (متفق علیہ)	وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے، پس بھلی بات کہہ دے اور بھلائی پہونچا دے"

قاضی بیضاوی نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ "وہ اس کے پاس ایسی باتیں پہونچا دے جن کو سن کر وہ مان جائے اور اپنی شر کی باتوں کو چھوڑ دے"۔

سر ولیم میور کی عربی دانی کا خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اصل حدیث پر غور کرتے، اور خود اس کا صحیح ترجمہ کرتے، انھوں نے کپتان اے۔ این میتھیو کے غلط ترجمۂ مشکوٰۃ کو اختیار کیا، اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ "گو وہ کلمات دروغ ہوں" اپنے ترجمے میں بڑھا دیے، جبکہ وہ الفاظ حدیث میں نہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا لفظ بولتے ہیں، اس لیے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں داخل نہیں، یعنی جو سزا ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے، اس سزا کا مستحق یہ آدمی نہ ہوگا جس نے صلح کی غرض سے صرف اچھی باتوں کا تذکرہ کیا ہو" (خطبات احمدیہ: ۴۰۸)

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں وہ ہے کسی عورت کو ترغیب دینے میں یا سفر یا مہم میں، کسی عورت کو ترغیب دینے کے الفاظ بھی سخت گمراہ کن ہیں، جبکہ سر ولیم میور کی مراد "اپنی بیوی کو ترغیب دینے" اور اس کی دلداری کرنے سے ہے،

وہ لکھتے ہیں کہ تیسرے موقع کیلئے "ہمارے پاس ایک افسوسناک نظیر موجود ہے کہ محمد صاحبؐ نے ماریہ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی (دوسری) ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے کو معیوب نہ سمجھا"۔ اور چوتھے موقع کی مثال یہ دی ہے کہ پیغمبر صاحبؐ کا معمول تھا کہ "ترتیب مہمات کے وقت (تبوک کی مہم کو مستثنیٰ کر کے) اپنے اصل مدعا کو پوشیدہ رکھتے تھے، اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے"۔ سرسید نے ان دونوں موقعوں کی جو وضاحت کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے، کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے، اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا، اور چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے، پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو، کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو عام کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے، لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے اعلان جنگ نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکہ ہو، بلاشبہ اخلاق اور صداقت کے خلاف ہے، لیکن جب جنگ کا اعلان اور اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو اور اس سے اپنے عزائم اور جنگی منصوبوں کو مخفی رکھنا صداقت کے خلاف نہیں ہے"۔ (خطبات ص ۴۰۹)

اسلامی روایات میں "مقدس جھوٹ" کی جستجو کے لیے سر ولیم میور نے جو جانفشانی کی ہے، سرسید احمد خان اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے، مذہب اسلام پر عائد کرنا چاہتے ہیں، مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی

خیال نہیں آیا ہوگا، کیونکہ صدق حقیقی قرآن کا لب لباب اور جوہر ہے، اور سچائی اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جبکہ "مقدس جھوٹ" کا تصور قرآنی سچائی کے برخلاف ایک دوسری چیز ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جیسا کہ تاریخ میں ہے، صاف صاف ثابت ہوتا ہے، ارکان مذہبی میں ایک رکن "مقدس جھوٹ" بھی تھا، اور ہم کو تعجب ہے کہ مقدس پال حواری اس کو گناہ تو کیا سمجھتا، برا بھی نہیں جانتا تھا، اس بات کو عیسائی عالموں نے خود مقدس پال کے اس کلام سے ثابت کیا ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لیے میں گنہگار گنا جاتا ہوں"۔ (پال کا خط رومیوں کو، باب ۳ درس ۷) سرسید تاریخی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا جو عیسائیوں میں رائج تھا، ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ "کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ" نامی کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "کلیسا کا شریف اور راست باز فرزند موشیم جس کی سند اور تسلیم شدہ سچائی پر پادریوں نے کبھی شبہہ نہیں کیا، وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پیروان افلاطون و فیثاغورث کا یہ اصول تھا کہ صدق و پرہیزگاری کی صفات کو ترقی دینے کی غرض سے دھوکہ دینا یا بوقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن ہے، حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے ہی مصر کے یہودی پیروان افلاطون و فیثاغورث سے یہ اصول سیکھ چکے تھے جیسا کہ بے شمار تحریروں سے کسی حجت اور اعتراض کے بغیر یہ بات ثابت ہو چکی ہے، عیسائیوں میں یہ غلطی دونوں راستوں سے در انداز ہوئی، چنانچہ ان کے یہاں نامی گرامی اشخاص کی طرف بے شمار کتابوں کو غلط طور پر منسوب کیے جانے سے یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی، موشیم کے بیان کے مطابق صرف دوسری صدی ہی میں بے شمار انجیلیں اور خطوط گھڑے گئے اور دوسروں کی طرف غلط طریقہ سے منسوب کر دیے گئے، چوتھی صدی میں دینی مقاصد کی ترقی کیلئے دھوکہ اور مقدس جھوٹ پچھلے زمانوں سے بھی بڑھ گیا تھا، گبن نے یہ لکھا ہے کہ "دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں مجھے یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کھلم کھلا اپنی طرف سے باتیں ملا دیتے

ناموری سمجھتے تھے، صرف اس لیے کہ ان کے نئے عقیدوں کو علماء کفار (غیر مسیحی فضلاء) گوش دل سے سنیں گے،
(کرشچین میتھالوجی ان فیلڈ، ص ۸۲ - ۸۰) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انجیل کی کوئی بات
دین داروں یا ملکی حاکموں کے اغراض کے موافق نہیں ہے تو اس میں ضروری تبدیلیاں اور تحریفات کر لی
جاتیں، اس کے علاوہ طرح طرح کے اور مقدس جھوٹ اور جعلسازیاں جو رائج تھیں، ان کو بہت سے
پادریوں نے جائز قرار دیا تھا، (ایضاً ص ۵۲) اسی کتاب میں یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ "اول کی تین[۳]
صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں، اور جو کچھ علم ہے وہ نہایت خراب اور بگڑے
ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان روایتوں اور حکایتوں کے بیان کرنے والے جو اس زمانہ میں
گذرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں،
مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ ان سے بھی سبقت لے گیا، وہ خود فخریہ
بیان کرتا ہے کہ "جس بات سے ہمارے دین کی عظمت اور نام آوری بڑھے میں نے بیان کر دیا ہے اور جو
اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو، میں نے سب چھوڑ دیا ہے (ایضاً ص ۶۶) مندرجہ بالا مثالوں کو
نقل کرنے کے بعد سرسید نے مقدس جھوٹ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

(دور اول کے عیسائی مورخین) کی تحریروں میں ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے، جسمانی خواہش اور
خوف ایمانی کے درمیان غلبہ حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں ..... اور انجیل کی بے شرمانہ تحریفات
اور تصرفات کی مدد سے کلیسائے روم نے عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر پھیلا
دیا تھا، جس نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا، انھوں نے اس مقولہ کی تلقین کی جو موشیم کے الفاظ
میں یہ ہے کہ "دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں، کار ثواب ہے"
کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس بے قید اصول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمے کا دہانہ
کھول دیا جس کا پانی ابتداءً دین عیسوی کی سرزمین پر طوفان کی طرح چھا گیا، اور جس نے ان فریبوں

اور باطنی صفات کو رواج دیا، جو اس زمانہ میں عیسائیان رومن کیتھولک کی بدنامی کا سبب ہیں،
(دور اول کے یہ عیسائی مورخین) اور اول سے آخر تک ان کے سوانح نگار کفر آمیز سفلگی عقیدہ
میں خوش فہمی، تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے، لیکن اس کے باوجود پطرس حواری کے جانشینوں
نے ایسے لوگوں کو پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں جگہ دی ہے۔

سر ولیم میور کے لیے یہ مناسب تھا کہ مذکورۂ بالا حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اسلام
پر مقدس جھوٹ کا الزام لگانے کی بے جا طور پر کوشش نہ فرماتے، اسلام سرتاپا صدق ہے، وہ
نہایت درجہ کی سچائی اور راست بازی کا دین ہے، اور اسی حیثیت سے اس کو یہ حق ہے کہ
دوسرے دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اپنی فوقیت اور برتری
کے لیے دعویدار ہو۔" (خطبات ص ۴۱۳)

اختلاف قراءت، قرآن اور بائبل میں

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سات
حرفوں پر اترا ہے، جس طرح آسان ہو پڑھو۔" اختلاف قراءت، فن تجوید قرآن کی ایک
اصطلاح ہے جس کے سمجھنے میں عیسائی مصنفوں کو سخت دھوکہ ہوا، اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بائبل
(عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں) میں اختلاف قراءت ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی اختلاف قراءت
ہے، حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف ہیں، اور جو اسباب عہد عتیق اور عہد جدید میں مختلف قراءتوں کے
پیش آتے ہیں، ان میں اور قرآن مجید کی قراءت سبعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر ہم قرآن مجید کی
قراءت سبعہ یا اختلاف قراءت کو ان ہی معنوں میں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے تو یہ بات
واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف قراءت سرے سے پایا ہی نہیں
جاتا، مسلمانوں میں اختلاف قراءت کی تمام صورتیں صحیح اور درست ہیں، لیکن بائبل کے اختلاف قراءت کی
نوعیت بقول رورنڈ مسٹر ہارن یہ ہے کہ دو[۲] یا زائد مختلف قراءتوں میں سے صرف ایک ہی قراءت صحیح

ہوسکتی ہے اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی۔" وہ عہد عتیق اور عہد جدید میں اختلافِ قرارت کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

(۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) جن نسخوں سے نقل کیا گیا ہے ان میں پہلے سے سقم اور غلطیوں کا پایا جانا۔ (۳) کسی معتبر سند کے بغیر کاتبوں کی طرف سے متن کی عبارت میں اصلاح کی خواہش (۴) وہ تحریفات جو کسی فریق کے حصول مدعا کے لیے قصداً کی گئی ہوں۔

بائبل میں اختلاف قرارت کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی قرآن کے اختلافِ قرارت کی اصطلاح سے تعلق نہیں رکھتی، قرآن مجید میں اختلاف قرارت کی ایک صورت جو دور اول میں پائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں نے جتنا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، مختلف سورتیں یا آیتیں وہ اپنی بیاضوں میں چمڑوں کے ٹکڑوں پر یا اور دوسری چیزوں پر بغیر کسی ترتیب کے لکھ لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت کا رواج تھا، تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا، قرآن کے حافظ موجود تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ترتیب طے شدہ تھی، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ خلافت میں تمام صحابہ کی رائے سے حافظوں اور دوسری تحریروں کی مدد سے، حضرت زید بن ثابت رضؓ کی نگرانی میں قرآن کو ایک جلسہ میں مرتب کرلیا گیا، اس لیے نامکمل بیاضوں کی وجہ سے جن میں ادھر ادھر بے ترتیب آیتیں لکھی ہوئی تھیں قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ناواقفیت کی بنا پر اب بے ترتیبی کا امکان ختم ہوگیا، اور جب حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں زید بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کردی گئیں تو اختلاف قرارت کی مذکورہ بالا نوعیت کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہ گیا۔

دنیا کی ہر ایک زبان کی طرح عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی بعض لفظوں کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا تھا، قرآن مجید کی سات قراتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ کو مختلف قبیلے اپنے اپنے تلفظ کے

مطابق پڑھ سکتے ہیں، لیکن جہاں تک قرآن مجید کی کتابت کا تعلق ہے تحریر کی حد تک الفاظ قرآن کے تلفظ کا یہ اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہوگیا ہے، چنانچہ سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ:

"قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کامیابی ہوئی ہے، قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھا کرتے تھے، لیکن چونکہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ دوسرے قبیلوں سے ادا نہیں ہوسکتا تھا اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا، مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے، مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید پڑھنے میں محسوس ہوگا، نہ کہ اس کے املا میں، اور اسی لیے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آسکتا، اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے"

(خطبات ص ۴۳۵)

حاضر وغائب کے صیغوں یا اعراب وابواب کا اختلاف جو پایا جاتا ہے وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، اور پھر چند ہی جگہوں میں ہے جس سے قرآن مجید کے اصلی مطلب یا احکام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا، اور قرآن مجید کے حاشیوں میں ان کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور تفسیروں میں ان پر پوری بحث موجود ہے، اس لیے:

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اور جو الزام عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کمی بیشی کرنے کا یا آیتوں کو چھپا ڈالنے کا عائد نہیں ہوسکتا علم ادب کی یہ شاخ جو قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا نام علم تجوید ہے، اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور علماء نے شرح و بسط سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔" (ایضاً ص ۴۳۶)

ناسخ و منسوخ کے بارے میں

حالات اور موقع و محل کی مناسبت سے احکام شریعت میں تبدیلی انبیائے کرام کے ذریعہ بحکم خداوندی ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی کو نسخ کہتے ہیں، حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ کہا جاتا ہے، فقہائے اسلام کے یہاں ناسخ و منسوخ کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی، مثلاً انھوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا تو انھوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا، حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے، اور بقول سرسید احمد خان فقہاء نے یہ رائے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقوں کو آسان بنانے کے لیے اختیار کی ہے، مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے، لازم نہیں آتی۔

قرآن مجید کی آیت نسخ اور فقہاء کی اصطلاح ناسخ و منسوخ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی عالموں نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے، اور ان کو صریح مغالطہ ہوا ہے، جس کا اندازہ درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے:

"مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے قرآنی آیات محمد صلعم کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، جو ان کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے، اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول کے ذریعہ رفع ہو گیا کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیلی یا ترمیم ہو گئی ہے۔" (گبن)

"اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے، مگر مسلمان اس اجتماع ضدین میں تطبیق کی تا بہ امکان کوشش کرتے ہیں، تاہم مجبوراً ان کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ کم سے کم دو سو پچیس ۲۲۵ آیتیں منسوخ ہیں۔" (سر ولیم میور)

(باقی)
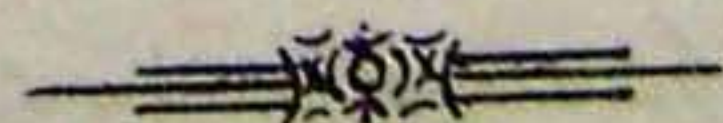
ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

"یہ مقالہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے اس سیمینار میں پڑھا گیا جو ۱ر۲ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منانے کے لیے منعقد ہوا تھا۔"

اس خاکسار سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے کس انسان کو سب سے بہتر دیکھا، اور کس کو سب سے اچھا ماہر قرآنیات، سب سے اچھا ماہر حدیث، سب سے اچھا متکلم، سب سے اچھا مورخ، سب سے اچھا سیرت نگار اور سب سے اچھا انشاپرداز پایا تو میں یہی عرض کروں گا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو۔

کسی کو حق ہے کہ اس رائے سے اختلاف کرے، لیکن اس کے بعد اس کی اور اس خاکسار کی راہیں الگ الگ ہوں گی۔

اس خاکسار نے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نجی، خانگی، بیرونی، علمی اور روحانی زندگی کے مختلف جلووں کو برسوں تک دیکھا ہے، ان کی تھوڑی سی بھی عکاسی کرنا اپنی کج مج بیانی کی بنا پر ممکن نہیں پھر بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے چہرہ پر نظر پڑتی تو سنجیدگی و متانت کے پھول بکھرے نظر آتے، اس کی سپیدی ایسی تھی جیسے کنول کا وہ رنگ ہو جو ابھی بالکل کھلا نہیں ہے، بلکہ کھلنے والا ہے، اس کے اوپر

داڑھی ایسی دکھائی دیتی جیسے کسی صنّاع نے ریشم کے خوبصورت، نرم اور باریک دھاگوں میں اپنی پوری صنعت گری دکھائی ہو، آنکھوں کی پلکیں کہتی کہ کسی فسق و فجور کی طرف بھولے سے نہ اٹھی ہوں گی، لب ایسے تھے جیسے شاید کسی ناروا بات کے لیے کبھی نہ کھلے ہوں گے، پیشانی کشادہ تو نہ تھی لیکن دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ یہ حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لیے شاید سجدوں میں ہزار بار تڑپتی رہی ہوگی، کاندھے جھکے جھکے تھے، جیسے کسی بار کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور اس سے ان کا جسم دب گیا ہے، ان کے ہمنشیں اور جلیس کہتے کہ یہ بار علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، ان کی انگلیاں دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا کہ یہ صرف قلم پکڑنے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں، وہ چلتے تو معلوم ہوتا کہ وزن و وقار ان کے قدموں کو چوم رہے ہیں، وہ کھانا تناول فرماتے تو لقمے اٹھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے شکر گزار ہو کر یہ لقمے منہ میں ڈال رہے ہیں، کھاتے وقت کام و دہن کی ستر پوشی کا خیال رکھتے، کبر سنی پر عینک لگانے لگے تھے، عینک کی کمانی پسند کرنے میں اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیتے، اور جب وہ آنکھوں پر لگتے تو ان کے رخِ زیبا کی وجہ سے خود عینک میں زیبائش پیدا ہو جاتی، لباس آخر آخر وقت تک بہت ہی صاف، مطہر اور پاکیزہ زیب تن کرتے، کبھی ان کے جسم پر شکن بھرے یا میلے کپڑے نہیں دیکھے گئے، شیروانی بہت اچھی سلی ہوئی پہنتے، جیسے وہ ان کے جسم پر ڈھال دی گئی ہو، شیروانی کے کپڑے ہی کی کشتی نما ٹوپی [illegible] اس کے اوپر خود صافہ باندھتے، تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی بدولت حسن، متانت اور وقار کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، پٹنہ ہی کے ایک جلسہ میں مغرب کے وقت صافہ اتار کر وضو کرنے لگے، وہاں مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی تشریف فرما تھے، جب سید صاحبؒ نے صافہ اتارا تو اس کے اندر سے کشتی نما ٹوپی جو نظر آئی تو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے دیکھ کر فرمایا: اچھا مولانا! آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، حضرت سید صاحب نے برجستہ جواب دیا: مگر مذہب اوپر ہے، اور قومیت نیچے ہے، یہ سن کر مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دوسرے لوگ ہنس پڑے، سید صاحبؒ کی سیاسی

زندگی کا یہی مسلک رہا، ان کو اپنے آبائی گاؤں سے بھی بڑی محبت رہی، اس کے کوچے ان کے لیے کوچے نہ تھے، بلکہ اوراق مصور تھے، یہاں کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آتی، چھٹیوں میں یہاں آتے اور جب جانے لگتے تو دیکھنے والے ان کی آنکھوں کو اشکبار پاتے، ان کا آبائی گھر قدیم وضع کا بنا ہوا تھا، لیکن اس سے بڑی محبت کرتے اس کے اندر داخل ہوتے تو ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی جو شاہ جہاں کو اپنے دہلی دروازہ سے اپنے لال قلعہ میں داخل ہونے میں ہوتی ہوگی، بچپن میں ان کے بڑے بھائی گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کی خاطر پردے کی آڑ سے وعظ کہا کرتے، اس موقع پر وہ ان سے مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان بھی پڑھوایا کرتے تھے، اس کتاب کی افادیت کا اثر ان کے ذہن پر آخر وقت تک چھایا رہا، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "اس کو پڑھ کر جن باتوں نے جڑ پکڑ لی تھی، وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے، لیکن حضرت مولانا اسماعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی۔"

دیسنہ سے نکل کر اپنی ابتدائی تعلیم کے لیے پھلواری شریف کی خانقاہ کے مدرسہ میں پہونچے، اپنی آیندہ زندگی میں اس کو اس طرح یاد کرتے رہے، جیسے کوئی دلگیر نہیں بلکہ عاشق بامراد کوچۂ یار کو یاد کرتا ہے، حضرت مولانا شاہ محی الدین مرحوم کے ساتھ ان کا قیام تھا، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت بھی حاصل کی، اس نسبت پر ہمیشہ ان کو برابر فخر رہا، وہ فرماتے کہ ان کا بزرگانہ تبسم ان کی آنکھوں کے سامنے برابر رہا، یہیں شاہ سلیمان پھلواروی سے منطق کے ابتدائی درس بھی پڑھے، ان کی وفات پر معارف میں جو نوحہ کیا تو انھوں نے ان کے وعظ، نغمۂ پرشور، اعتزال سے ان کی برہمی، اہل بیت ان کی محبت، ان کے سنجیدہ چٹکلے، ظریفانہ نکتے، ان کی شیریں بیانی وغیرہ کا جس طرح ذکر کیا ہے، اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین ایک دلآویز افسانہ کی افسانویت اور تغزل کی موسیقیت کا لطف اٹھائیں گے

انھوں نے دربھنگہ میں کچھ دن قیام کیا تو اسی زمانہ میں پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار الپنچ (۲۱ر جون و ۲۵ر جولائی ۱۹۰۳ء) میں خاتونوں کی تعلیم کے عنوان سے انکا ایک مضمون کیا شایع ہوا کہ اس سے انکی دبی ہوئی مضمون نگاری کی صلاحیت جو ابھری تو ابھرتی چلی گئی، پھر ندوہ میں داخل ہوگئے، بہار کی محبت، یوپی سوغات میں لے گئے، اس لیے اپنے نام کے ساتھ بہت دنوں تک بہاری لکھتے رہے، اور گو ان کی پوری زندگی یوپی میں گذری، لیکن وہ بہار کو کبھی نہ بھولے جب کبھی یہاں کی کوئی قابل قدر شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی تو آنسو بہا کر اپنی سوگواری کا اظہار کیا، اسی لیے مولوی عبدالغنی صاحب وارثی، مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری، مولوی ابوالحسنات ندوی، جناب شاد عظیم آبادی، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر، صلاح الدین خدا بخش، سر علی امام، سر فخرالدین، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا سجاد، حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی، شاہ محی الدین پھلواروی اور مولانا عبدالرؤف داناپوری پر جو تعزیتی تحریریں لکھی ہیں ان کے قلم کے جواہر ریزے کہے جاسکتے ہیں۔

بہار کے نوجوان ادیبوں کے نام ان کا جو پیام ہے، اس سے کیسی دلسوزی اور بہار سے شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

دارالعلوم ندوہ آئے اور علامہ شبلی پر ان کی نظر پڑی تو ان کو علم کی موج ہوا پہ کاں نظر آئی اور ان کا دل کہہ رہا تھا کہ شاید کہ علم کی بہار آئی اور اپنے ساتھ علم کی زنجیر بھی لائی، رفتہ رفتہ مولانا شبلی پر ان کی نظر اس طرح پڑنے لگی جیسے افلاطون پر ارسطو کی نظر پڑی ہوگی، مولانا شبلی کی افلاطونیت سے، ان کی ارسطویت کی چنگاری سلگتی رہی، یا یوں کہیے کہ ان کو ایک ساقی مل گیا، جو جلباب ظلمانی کی مے پلانے لگا، اس طرح کہ اس کے ساتھ چراغ نور ایمانی سے ان کی خرد میں نور پیدا ہونے لگا۔

علامہ شبلی کی نگاہ جوہر شناس دیکھ رہی تھی کہ اس علم کے عالم ناسوت میں ایک طائر نظر آرہا ہے جو کیا عجب علم کا لاہوتی بن کر اس فضائے جبروتی و ملکوتی بھی بن جائے، ایک جلسہ میں اپنے اس شاگرد کی

ایک برجستہ تقریر سے ایسے مسحور ہوئے کہ غایت محبت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، باندھتے وقت زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ اس کو علم کی کلاہ مہر عالم تاب ہونا ہے اور یہ ہوکر رہی خود حضرت سید صاحبؒ اس کے بارے دبے رہے، اور انھوں نے اپنی شاگردی کا حق جس طرح ادا کیا وہ غزل کے تغزل سے کم نہیں رہا۔

ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں لاہور کے رسالہ مخزن (دسمبر ۱۹۰۲ء) میں آخر وقت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، پھر علی گڑھ منتھلی میں مذہب (نومبر ۱۹۰۵ء) اہل اندلس کے اخلاق اور عہد سے (نومبر ۱۹۰۵ء) کلیلہ ودمنہ (اگست ۱۹۰۶ء) طبعیات (اکتوبر ۱۹۰۶ء) کے عنوانات سے جوان کے مضامین چھپے تو پھر باب علم اور وا ہوتا گیا، مولانا شبلیؒ کی نگرانی میں الندوۃ میں مضامین لکھنے شروع کیے، طرح طرح کے نئے نئے عنوانات منتخب کرکے اپنے علمی دماغ کی زرخیزی اور ذہن کی بلند پروازی کا ثبوت دیا، ان علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو ان ہی مضامین کے سبب وہ باعظمت اہل قلم کی صف میں کھڑے کیے جانے کے لائق تصور کیے جاتے، مگر اپنی زندگی میں عام مقالہ نگاروں کی طرح کبھی ان کے مجموعے شایع کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اگر وہ شایع کیے جاتے تو کئی جلدوں پر مشتمل ہوتے، اسی طرح جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کچھ دنوں الہلال میں کام کیا تو ایسی بھی بہت سے مضامین الہلال کے رنگ میں لکھے البلاغ میں بھی ان کے مضامین شایع ہوتے رہے، ان کے مجموعے بھی شایع نہیں ہوئے، حالانکہ وہ چاہتے تو یہ آسانی سے شایع ہوسکتے تھے، کیونکہ دارالمصنفین کے قیام میں اس کے پریس کا عملہ ان ہی کے ماتحت کام کرتا رہا، مگر ان کو یہ خیال رہا کہ ان چیزوں سے بہتر چیزیں ابھی پیش کرنی ہیں، اس لیے اپنے اس ابتدائی دور کی چیزوں کی اشاعت پسند نہیں کی۔

۱۹۱۵ء میں جب اپنے استاد کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین آئے اور اس کی میز پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے، تو لوگ اپنی چشم بینا سے دیکھتے کہ وہ علم و فن کے تخت طاؤس پر بٹھا دیے گئے ہیں،

اسلام کا مینا کار اور مرصع کار تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، ان کے دائیں طرف تلاش و تحقیق کے ماہی مراتب، بائیں طرف محنت و ریاضت کے عصا و علم ہیں، سامنے عالمانہ نکتہ رسی، مورخانہ دیدہ وری اور ناقدانہ ژرف نگاہی کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، اور یہاں ان کی نظروں کے سامنے علامہ شبلی ایک بیا مانشاط پر جلوہ افروز ہیں، اور شراب علم کا شیشہ و ساغر لیے ساری فضا میں کیفیت میخانہ پیدا کر رہے ہیں، اپنی نظر و فکر کی زنگا رنگی کا چتر بھی انکے سر پر ڈالے ہوئے ہیں، اور اپنی تحریر کے اسلوب اور انداز بیان کا کوکبہ بھی دکھا رہے ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ اپنی میز پر سے اٹھ کر اپنے معاصروں ہم جلیسوں، ہم نشینوں اور شاگردوں کے بیچ میں آکر بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ طہارت، نظافت، شرافت، تمکنت، عظمت، پاکیزگی، سنجیدگی، احترام کا پیکر محسوس سامنے ہے اور فضا میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی اور یہی سارے اوصاف ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آئیں گے۔

۱۹۱۶ء سے ان کی ادارت میں معارف کا نکلنا شروع ہوا، معارف میں ان کے شذرات سے ان کی تحریروں کے اسلوب کی بوقلمونی دکھائی دیگی، شذرات کے معنی سونے کے ٹکڑے ہیں، اور یہ واقعی شذرات ہیں، انھوں نے معلوم نہیں کس کس طرح نظر و فکر، جذبات و احساسات، علم و فن اور حکمت و معرفت کا سونا پگھلایا، ان میں کہیں دل کی دھڑکنیں ہیں، کہیں ان کے سینہ کے اندر جو کھنک سی رہی وہ جس طرح غم منزل بنتی رہی اس کا پر تو بھی ان میں دکھائی دے گا، ان تمام چیزوں کو قلمبند کرتے وقت ان کی کوشش رہتی کہ کہیں سے انا کی بو نہ آئے، وہ اپنی تحریروں کو حتی الامکان نیش خار سے آلودہ نہیں کرتے ان کو شرافت اخلاق کے موتیوں سے جھلملاتے دیکھنا پسند کرتے، البتہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو پھر اس کا جواب لکھنے میں ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، پھر اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی جو بقول ان کے سات سمندر کا پانی بھی اس زہر کو

زائل نہیں کر سکتا تھا، عام طور سے ان کے شذرات ان کی تحریر کے ایجاز کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں۔

معارف میں انھوں نے شذرات کے ۱۱۹۲ اور مضامین کے ۱۹۰۰ صفحات لکھے، ان میں قرآن مجید اور حدیث، تاریخ، کلام، فقہ، ادب اور شعر و شاعری سب پر مضامین ہیں، قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم و فن کے شالیمار میں قرآن پاک کی آیتوں کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، احادیث پر کوئی تحریر قلمبند کرتے تو ظاہر ہوتا کہ اس شالیمار میں حدیث کے رموز و نکات کے گلکدے دکھائی دے رہے ہیں، کلامی رنگ کی کوئی چیز لکھتے تو ان کے خیالات کے سوسن و یاسمین کھلے نظر آتے، تاریخ کا کوئی موضوع اختیار کرتے تو تحقیق و تدقیق کے سرو و شمشاد نظر افروز ہوتے، شعر و ادب کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تو نکتہ سنجی اور نکتہ رسی کے پھول بکھرے دکھائی دیتے، معاصر مشاہیر کی موت پر نوحہ کرتے تو ان کی سوگواری اور غم ناکی کی گھٹائیں چھائی دکھائی دیتیں، کسی کانفرنس کے لیے خطبہ لکھتے تو یہ ان کے نظر و فکر کا شیش محل بن جاتا،

دارالمصنفین کے اشاعتی کاموں کے سلسلہ میں اپنی مختصر تصنیف حیات امام مالک شایع کی، یہ ان کی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں وہ مضامین ہیں جو الندوہ میں لکھے تھے، یہ ان کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں، بلکہ ایک نامکمل کتاب ہے، لیکن اس کی مانگ اب تک جاری ہے، اس میں امام مالکؒ سے جو اپنی عقیدت ظاہر کی ہے، اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مالکی ہو گئے ہیں، لیکن آخر وقت تک وہ حنفی ہی رہے، یہ ان کی رواداری اور فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ میں جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف برابر کرتے رہے، انکو امام مالک سے عقیدت اس لیے ہوئی کہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دار الہجرۃ، اور بانی اول فن حدیث تھے، اسی کے ساتھ مسلک حنفی کے علاوہ فقہ کے بقیہ تین مذاہب کے سلسلے ان ہی کی شاخیں ہیں، اسی کے ساتھ ان کو امام مالک کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی، اس لیے ان پر ایک مضمون لکھنے بیٹھے تو یہ اتنا پھیل گیا کہ پھر ایک کتاب بن گئی۔

۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مرحوم کی سیرۃ النبیؐ جلد اول مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا، استاد کو آخر وقت تک اس کا غم رہا کہ اپنے حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ میں آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہیں چڑھا سکے تھے، لیکن لائق شاگرد نے اپنے استاد کی طرف سے اس کو شایع کرکے آستانۂ نبوت پر استاد کی عقیدت کا گلدستہ چڑھایا، اور وہ خوش تھے کہ ؏ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔

اس کا مسودہ پھیل رہا تھا اس لیے اس کی دو جلدیں کر دیں،

اس کی دوسری جلد کی اشاعت سے پہلے سید صاحب کی مشہور کتاب ارض القرآن کی پہلی جلد شایع ہوئی جو انھوں نے پونا کے قیام میں لکھی تھی، ارض القرآن کا موضوع بڑا خشک ہے، اس کے اندر جو عنوانات لکھے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر ہمارے وہ ناظرین جو فسانۂ آزاد اور فسانۂ عجائب کے پڑھنے کے عادی ہیں ان کا ہاتھ تو اس کتاب کو چھونے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا، یا ایسے ناظرین جو ذرا بہتر ذوق رکھ کر مقدمۂ شعر و شاعری یا سخندان فارس یا آب حیات پڑھتے ہوں، ان کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھ کر کسی اور طرف مائل ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یا ان سے اونچے ذوق رکھنے والے ناظرین اس کے اوراق کو الٹ پلٹ کرکے اس کو چھوڑ دیں تو ان سے بھی کوئی شکایت نہیں، یا وہ ناظرین جو مولانا شبلیؒ کی تصانیف کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری سے متاثر ہیں، وہ ان ہی کے شاگرد کی اس کتاب کو ایک بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیں تو بھی ان سے کوئی گلہ نہیں، مگر جب کبھی اس کی تلاش ہوگی کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں تحقیق کی دیدہ وری، نظر کی پہنائی، فکر کی گہرائی اور محنت کی جگر کاوی سے کون کون سی کتابیں لکھی گئیں تو ارض القرآن کی دونوں جلدیں اس فہرست میں ضرور شامل کی جائیں گی۔

سید صاحبؒ کو اپنی اسلامی حمیت و غیرت کی وجہ سے دکھ تھا کہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور

انگریز مستشرقین تاریخ عرب قبل از اسلام پر محققانہ کتابیں لکھ رہے ہیں اور غلط قسم کے نتائج اخذ کرکے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، مثلاً نولدیکی نے یہ لکھا کہ قرآن میں جن قوموں کا ذکر ہے وہ غیر تاریخی ہیں، رابرٹسن اسمتھ اور ڈیکمن نے عربوں کے ادعائے نسب سے انکار کیا اور بعض سبک مغز مصنفوں نے جرأت کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، سید صاحبؒ نے اپنی ان دونوں کتابوں میں ان مصنفوں کی تاریخی تحقیقات اور تلبیسات کا پردہ چاک کیا اور خود ان ہی کے کارخانوں سے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا۔

اس کتاب میں سید صاحب بڑی حد تک ابن حنیفہ دینوری، ابن قتیبہ اور ابن جریر طبری نظر آتے ہیں، جنھوں نے تیسری صدی اور چوتھی صدی ہجری میں یہودی اور ایرانی مورخوں کی اسی قسم کی فتنہ پردازی کا مقابلہ کیا تھا، کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، یہ نہیں معلوم ہوگا کہ کسی عربی مدرسہ کے سند یافتہ کی یہ لکھی ہوئی ہے، بلکہ تحقیق و تحریر دونوں کا انداز وہی ہے جو آج کل بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں کے محققوں کا ہوتا ہے، انھوں نے اپنی اس ابتدائی تصنیف میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ تحقیق و تلاش میں سہل انگاری، تن آسانی اور گریز پائی، علم کے دین و مذہب میں معصیت ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس علمی معصیت سے وہ اپنے دامن کو برابر بچاتے رہے۔

اپنی علمی زندگی کی بے پناہ مصروفیتوں کے ساتھ ہندوستان کی ملی اور سیاسی تحریکوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، جن میں ان کی ایمانی حرارت اور ملی غیرت زیادہ کارفرما رہی ہے، ہندوستان میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو اس میں اور رہنماؤں کے ساتھ برابر کے شریک رہے، لیکن ان کی شرکت کی نوعیت یہ تھی کہ وہ اپنے قلم سے اس میں علمی اور تاریخی جلا دیتے، اور اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ اور خلافت اور ہندوستان کے نام سے جو رسالے لکھے وہ تحقیقی اور تاریخی رنگ کے تھے، مگر اس تحریک میں بہت ہی کا معاون ثابت ہوئے، اور جب وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے اور وہاں سے جو خطوط لکھے

وہ "برید فرنگ" کے نام سے شایع ہوئے ہیں، ان کو اب بھی کوئی پڑھے گا تو ان سے ان کی گہری سیاسی نظر، عمیق ملی فکر اور زمانہ کے حالات سے ان کے مضطربانہ جذبات اور بے قرارانہ احساسات کا اندازہ ہوگا۔

وہ لندن ہی میں تھے تو ان کے استاد کی سیرۃ النبیؐ کی جلد دوم شایع ہوئی، سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد میں مودب شاگرد نے اپنے استاد کے مسودہ میں کسی قسم کی ترمیم کرنا پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ بار بار چھپنے لگی تو اپنے استاد کے تمام ادب و احترام کے ساتھ ہمت کرکے اس میں کہیں کہیں ترمیم و اضافہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا اہتمام کیا کہ جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا تو اس کو ہلالین میں درج کیا۔

وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب سیرت عائشہ شایع ہوئی، مولانا شبلیؒ کا اصرار تھا کہ وہی یہ کتاب لکھیں، اس زمانہ میں ان کی اور مشغولیتیں تھیں، اس لیے انھوں نے استاد محترم کو اس کتاب کے لکھنے کیلئے کسی اور کا نام تجویز کیا، مولانا شبلیؒ نے ان کو یہ لکھ کر جواب دیا کہ ان کا قلم ادب شناس نہیں (مکاتیب شبلیؒ حصہ دوم ص ۱۲۹) ان ہی سے یہ کتاب لکھنے کا اصرار کیا، یہ مولانا شبلیؒ کی بہت بڑی تحسین تھی، سید صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنے قلم کی اسی ادب شناسی کا ثبوت دیا ہے، پوری کتاب میں ادب و احترام نچھاور ہوتا ہوا دکھائی دے گا، تمکنت قلم کو جو ہستی نظر آتی ہے، وہ تو ہر سطر میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

یہ زمانہ خلافت کی تحریک اور ترک موالات کا تھا، ہندوستان کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا، برطانوی حکومت کی قہاری اپنی انتہا پر تھی، اسی کے ساتھ ہندو مسلمان کی محبت، یگانگت اور حب الوطنی کا سیلاب بھی رواں دواں تھا، سید صاحب سیاسی جلسوں کی صدارت کے لیے بلائے جاتے، اس کیلئے گرانقدر خطبات بھی لکھتے، لیکن سیرۃ النبیؐ کی تدوین میں بھی مشغول رہے، ۱۹۲۴ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم شایع ہوئی، اس کے کچھ صفحے تو مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں، بقیہ سب سید صاحبؒ کے ہیں، اس کا موضوع معجزات ہے، یہ کوئی دلآویز موضوع نہیں بلکہ خشک، مشکل اور سنگلاخ ہے، اس کے بعض مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحب نے

پھر ایسا طاقت ور انداز بیان اختیار کیا جس کو پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج پر پہونچ رہی تھی، ان کو قلمبند کرنے میں بھی ان کے قلم کی شگفتگی اور تحریر کی روانی ان کا پورا ساتھ دے رہی تھی، اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایۂ بیان مل رہا تھا جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ پیرایہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، پوری کتاب میں کہیں تو متکلمانہ انداز ہے، کہیں فلسفیانہ رنگ ہے، کہیں تاریخی کوائف ہیں، کہیں منطقیانہ مباحث ہیں، لیکن شروع سے آخر تک ان کے قلم کی گلکاریاں اور تحریر کی معجز طرازیاں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید ذہن کو جن چیزوں کی تلاش ہے وہ سب اس کتاب کے اوراق میں مل رہی ہیں، اور خیالات کے انوار حلۂ بہشتی بن کر دلوں کے اندر روحانی جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کتاب کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت، کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے اس سے سید صاحب کا علمی پایہ بہت بلند ہوا، اس میں کہیں ابن سینا، کہیں ابن رشد، کہیں ابن تیمیہ، کہیں ابن مسکویہ، کہیں مولانا روم، کہیں شاہ ولی اللہ اور کہیں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اپنی ساری فکری اور نظری بحثوں کی اساس قرآن مجید اور احادیث پر رکھی ہے۔

وہ ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز کے عمدہ رکن بن کر ابن سعود اور شریف حسین میں مصالحت کرنے کیلئے گئے، لیکن کامیابی نہ ہو سکی، ندوہ کے کاموں میں بھی مشغول رہے، لیکن اس سال ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ تصنیف ہے جو خطبات مدراس کے نام سے مشہور ہے، یہ ان کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، اس وقت تک سیرت نبویؐ پر ان کا بڑا گہرا مطالعہ ہو چکا تھا، جس سے اس کے سارے پہلوؤں سے نہ صرف رمز شناس بلکہ عارف ہو گئے تھے، اس لیے جب ان خطبات کو لکھنے

بیٹھے اور ان کو ختم کیا تو یہ کتاب ان کے مطالعہ کا عطر مجموعہ بن گئی اور شاید اس کو لکھتے وقت ان کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ کوئی روحانی قوت بلکہ یہ داتی طاقت ان سے یہ لکھوا رہی ہے، انداز بیان کے معیار کے لحاظ سے دنیا کی بہترین کتابوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی، یہ سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی ہی ایک تصنیف ہے، لیکن جس انداز بیان اور انشاپردازانہ خوبیوں کے ساتھ یہ لکھی گئی ہے، وہ اس کا امتیازی وصف ہے، اس کو پڑھتے وقت بڑے سے بڑا انشاپرداز بھی یہ محسوس کرے گا کہ کہیں اس میں انشاپردازی کی قوس قزح نظر آرہی ہے، کہیں اس کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے کہیں اس کی کوثر و تسنیم بہہ رہی ہے، کہیں زبان قلم کو چوم رہی ہے، کہیں زور بیان صاحبقرانی دکھا رہا ہے کہیں نظم سعدیؔ کا لطف دکھائی دے رہا ہے، ان خوبیوں کی بدولت پوری کتاب میں نبوت کا چمنستان آباد ہوگیا ہے، جس میں رسالت کے پھولوں کی روش لگی ہوئی ہے جو روح کو معطر معطر کرتی رہتی ہے۔

ان علمی کارگذاریوں کے ساتھ سیاسی مشغولیتیں بھی رہیں، کلکتہ میں اس سال جمعیۃ العلماء کا جو جلسہ ہوا اس کی صدارت بھی کی، اسی سال ہندو مسلمان کے تعلقات کی نسبت دہلی میں مجلس خلافت کے خاص اجلاس میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وہ وفد خلافت کے ساتھ حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی بھی تھے، وہاں ایک موتمر ہوا تو اس کے نائب رئیس منتخب ہوئے اور صدر محترم کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی، حجاز کے کتب خانہ کی سیر بھی کی اور معارف کے کئی نمبروں میں اسی عنوان سے ایک طویل مضمون بھی لکھا، وہاں سے واپسی کے بعد بعض مستشرقین کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوئے، عیسائی مضمون نگار مارگولیتھ سے زبردست علمی معرکہ بھی کیا، جو واقدی کا بڑا قائل تھا، لیکن سید صاحب نے ۲۷ء کے معارف میں متعدد مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، اور اس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں، تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا

ایسا ہی ہے جیسا ملکہ الزبتھ کی سوانح میں رینالڈس کا حوالہ دینا ہے۔

۱۹۲۷ء میں ایک یورپین اہل قلم نے لکھا تھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، اس کا ایک مدلل جواب دیا، پھر مسلمان عورتوں کے حقوق کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں یہ بتایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیل دین نے کیا، اور ان کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا،

اسی کے ساتھ ہندوستان کے مختلف گوشوں کا سفر بھی کرتے رہے ۱۹۲۶ء کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر عہد رسالت میں اشاعت اسلام پر تقریر کی، پھر مجلس العلماء کی صدارت کے لیے ترچناپلی تشریف لے گئے، پھر ندوہ کا ایک اجلاس بہاولپور میں ہوا تو نواب صاحب بہاولپور سے پندرہ ہزار کی رقم منظور کرائی، جمعیۃ العلماء کے ایک جلسہ کی صدارت کے لیے پشاور بھی گئے، پھر حیرت ہوتی ہے کہ ریل کی پیہم مسافرت کے باوجود ان کے قلم کا مسافر بھی برابر رواں دواں رہا، معارف میں ان کی قلمی سرگرمیاں جاری رہیں، سیرۃ النبیؐ کی تدوین کا سلسلہ بھی قائم رہا، پھر ملی کاموں میں اپنے قلم کے ذریعہ سے دینی ملی حمیت کو بھی بیدار کرتے رہے

۲۹-۱۹۲۸ء میں سارداایکٹ کے خلاف سخت علمی جنگ کی، اور اپنے مضامین سے برابر یہ ظاہر کرتے رہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں، اور یہ صدا شاید پہلی بار اٹھائی کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق کی ادنیٰ سی تدبیر نہیں کی تو ان کی ممتاز ہستی اس ملک میں باقی نہیں رہ سکتی۔

۱۹۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی کی دعوت پر الہ آباد جاکر عرب و ہند کے تعلقات پر لیکچر دیے، جن میں ہندو مسلمان دونوں کو وہ زریں عہد یاد دلایا جو دونوں کو بین الاقوامی

اور دوسرے گوناگوں تعلقات کے رشتہ میں جکڑے ہوئے تھا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات کا دجلہ، علمی تعلقات کا فرات اور مذہبی تعلقات کی گنگا جمنا کس طرح بہتی تھی، یہ کتاب ہندو مسلمان کے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے انگریزوں نے جو یہ سبق پڑھایا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کو کافر سمجھتے تھے، ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، ان سے جزیہ وصول کرتے تھے، ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کرتے تھے، اس زہر کا تریاق اس کتاب میں ہوگا اور خدا جانے اس کے سہارے سے کتنی اور کتابیں تیار ہوگئیں

حضرت سید صاحب وقت اور قلم دونوں کے ابلق پر اس طرح سوار رہے کہ کبھی ان کو وقت کی کمی اور قلم کی سستی کی شکایت نہیں ہوئی، وقت اور قلم دونوں ان کے قابو میں رہے، عرب و ہند کے تعلقات کی ترتیب کے دو سال کے بعد ان کی کتاب عربوں کی جہاز رانی شایع ہوئی، یہ بمبئی کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں جو چار خطبے دیے گئے ان ہی کا مجموعہ ہے، اس میں پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہاز رانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اسلام کے شروع دور کے علاوہ بنو امیہ، بنو عباس، فاطمیین مصر اور بنی امیہ اندلس کے زمانہ میں جو بحری لڑائیاں ہوئیں ان کی تفصیل ہے، اسی کے ساتھ مغربی ہند کی بندرگاہوں کے علاوہ افریقہ کے سواحل یعنی بحر روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکوں، سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ میں عربوں کی جہاز رانی اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے، اسی کے ساتھ بحر پیمائی اور فن جہاز رانی میں عربوں کی علمی سرگرمیوں، ان کے ایجادات و اکتشافات، سمندروں کے بارہ میں ان کے علم، ان کی پیمایش، ان کی کتابوں میں بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، میل کے نشانات، جہازرانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں کی کیفیت، قطب نما کی ایجاد و ترقی، ان کے ایجاد کردہ فلکی آلات، جہاز رانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے، جہاز کے ساز و سامان کی پوری تفصیلات وغیرہ

اس کتاب میں پڑھی جا سکتی ہیں، جہاز رانی کے سلسلہ میں عربوں نے جو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ معارف میں مضامین کے ذریعہ ان کا قلمی جہاد بھی رہا، انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں واقعۂ کربلا پر ایک نہایت قابل اعتراض مضمون نکلا تو سید صاحبؒ نے اس کے خلاف احتجاج کیا، پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر واکل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئی تو انھوں نے وہاں کے ارباب علم کو اس کی طرف توجہ دلائی، ان دونوں کتابوں میں اسلام پیغمبر اسلامؐ اور صحابۂ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں، جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کرتا، اس احتجاج پر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے نکال دی گئی، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے مذہب پر دلآزار مضامین لکھے تو اس کے خلاف بھی آواز بلند کی، جس کے بعد ایڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی کتاب سیرۃ النبیؐ جلد چہارم شایع ہوئی، یہ ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحبؒ کے قلم کی تیز روی اور سبک خرامی کسی طور پر کم ہوتی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت ان کی عمر ۵۲ سال ہو چکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہوگیا تھا، اس لیے کہ ع عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است۔

اس عشق میں منزل تک پہونچنے میں اپنی ساری عمر گذار دی، اس کے ٹائٹل پر تو یہ لکھا ہے کہ یہ منصب نبوت پر مشتمل ہے، لیکن اس میں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے وقت دنیا اور عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت، تبلیغ نبوت کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب رسول اللہ ﷺ کے پیغمبرانہ کام کی تفصیل بتائی گئی ہے، اور ان کے بعد اسلام کے عقائد یعنی ایمان کے مختلف پہلو، برزخ، قیامت، جزا، سزا، دوزخ، جنت، قضا، قدر پر مباحث ہیں، یہ مباحث بڑے نازک ہیں، اس خارزار

گذرنا آسان نہیں، لیکن ان کے لکھنے میں سید صاحب نے اپنی محتاط طبیعت کی وجہ سے کسی خاص فرقہ کی ترجمانی نہیں کی ہے، بلکہ اس کے لکھنے میں ہر موقع پر قرآن پاک سے استناد کو سب سے آگے رکھا ہے، احادیث صحیحہ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، مناظرانہ پہلو سے احتراز کیا ہے، اور پھر اسلام کا موازنہ دوسرے مذاہب سے اس غرض سے کیا ہے کہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو، یہ سارے مباحث بالکل نئے نہ تھے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلبگار ہے وہی پیرایہ اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا۔

سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے ساتھ ان کی اور قلمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں، مارچ ۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلّیٰ کی دعوت پر 'ہندوستان میں ہندوستانی' پر ایک خطبہ دیا، جس میں تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اس لیے اگر اردو کے بجائے 'ہندوستانی' نام رکھا جائے تو بہت سے لسانی قضیے دور ہو جائیں، پھر وہیں طبیہ کالج کے ہال میں 'اسلامی طب کی تاریخ' پر ایک تقریر کی، پھر اپریل ۳۳ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے، اس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی، اس میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان 'لاہور کا ایک مہندس خاندان' جس نے لال قلعہ اور تاج محل بنایا تھا، اس میں مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار درحقیقت استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے، جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس انکشاف کے بعد اور تمام دعوے جو تاج محل کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے۔

جولائی ۳۳ء میں جنوبی ہند میں سیرۃ النبیؐ پر مختلف تقریریں کیں، اور اسی سال نظام حیدرآباد کی حکومت کے لیے 'ضابطۂ جنایات قتل و قصاص' کی ترتیب دی، ان چیزوں کے ذکر کرنے کا

مقصد یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے ذوق کی جامعیت اور کاملیت کا اندازہ ہو، ان میں کیسی رنگا رنگی اور بوقلمونی تھی۔

اسی سال ان کی مشہور و معروف تصنیف "خیام" شایع ہوئی، اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق اور تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر اور کاوش کی ہے وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اہل یورپ کے اس خیال کی بالکل تردید ہو گئی کہ خیام ایک عیاش، بدمست، رند لاابالی شاعر تھا، جو ہمہ تن شاہد و شراب میں غرق رہتا تھا اور جس کے لیے زندگی رندی و عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھی، اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم و ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہل نظر نے یہ تسلیم کیا کہ اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا اس پر کوئی مستشرق یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

اسی سال وہ نادر شاہ افغانستان کی طرف سے ایک علمی و تعلیمی دعوت پر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ افغانستان گئے، اور وہاں کے تراجم اور تالیف کے ادارہ کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں مفید مشورے دیے، اس سفر میں علامہ محمد اقبالؒ اور حضرت سید صاحبؒ ایک دوسرے سے جس طرح متاثر ہوئے وہ اس برصغیر کی علمی اور دینی تاریخ کا بہت ہی رومانی اور دلکش باب ہے،

اس سفر کے سلسلہ میں سید صاحب نے 'سفرنامۂ افغانستان' بھی مرتب کیا، جو علمی، ادبی، تاریخی اور معلوماتی لحاظ سے ایک مستقل تصنیف بن گیا اس میں وہ ابن بطوطہ کے ساتھ ابوزید سیرافی بھی نظر آتے ہیں۔

سید صاحب حج سفر کے بعد دار المصنفین کے گوشۂ عافیت میں آکر تصنیف و تالیف میں لگ جاتے، لیکن پورے ہندوستان کی نظریں ان کی طرف اٹھی رہتیں، اور ان کو اپنے یہاں مدعو کر کے اپنی عزت میں لوگ اضافہ کرتے، فروری ۳۴ء میں جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر بہجت وہبی توسیعی خطبات دینے کے لیے آئے تو ان کے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب نے ہی کی، پھر جون ۳۴ء میں صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم جناب سید عبد العزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لیے رانچی تشریف لے گئے، اسی سال دسمبر ۳۴ء میں معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی حیثیت سے ترقی دی ہے، اس کی مفصل تاریخ لکھی جائے اور اس کی پندرہ جلدوں کا خاکہ پیش کیا، اور یہ کام دار المصنفین میں شروع کرا دیا، جنوری ۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے تو وہاں ڈاکٹر اقبال رح کے ساتھ مل کر ایک زنانہ جامعہ کا خاکہ تیار کیا، پھر اسی سال حیدر آباد کے ضابطۂ فوجداری پر نظر ثانی کیلئے اس کی ایک کمیٹی کی پوری مدد کی۔

اپنی ان تمام مشغولیتوں اور سرگرمیوں کے باوجود اسی سال ۳۴ء میں سیرۃ النبی صلعم کی جلد پنجم شایع کرائی، اس کا موضوع "عبادات" ہے، یعنی اسلام میں عبادت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اقسام کتنے ہیں، اور ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، ان ہی چیزوں کی تشریح اس جلد میں کی گئی ہے، ان میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات بھی نئے نہیں ہیں، لیکن ان موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا انداز کچھ ایسا نیا ہے کہ اس میں سید صاحب مفسر، محدث، فقیہ اور متکلم سب کچھ نظر آتے ہیں، کلام پاک کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں، تو وہ انکی تحریروں میں موتی کی طرح جڑی دکھائی دیتی ہیں اور جب لمبی آیتیں نقل کرتے ہیں تو وہ اپنی تحریروں کو موتیوں کا کوئی ہار پہناتے نظر آتے ہیں، وہ جب مفسر بن کر اس کی تشریح دلنواز طریقہ پر کرتے ہیں،

تو معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر میں اردو زبان کا خوان نعمت بچھا رہے ہیں، اسی طرح احادیث کا ذکر کر کے ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک محدثوں کے جو خیالات اور جذبات دبے ہوئے تھے ان کی تحریروں میں ابھر رہے ہیں، ان موضوعات پر فقہا میں بڑا اختلاف رہا ہے، ان دشوار گذار راہوں کو بھی سید صاحب نے جس طرح طے کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بڑے بڑے متقشف فقہا کو بھی اختلاف نہیں ہوا ہے، اور ان کے لکھنے میں جو کلامی رنگ پیدا کر دیا ہے، اس سے بڑا سے بڑا متکلم بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے،

اکتوبر ۳۵ء میں اردو ہندی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، تو اس کے روز افزوں جھگڑوں سے ان کو بہت دکھ پہونچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ سے ان دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنا چاہئیں، نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا کانفرنس میں ظاہر کیے جو اکتوبر ۳۶ء میں ہوئی، اسی زمانہ میں یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی ابال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، سید صاحب رح نے بھی فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی اور مولانا شوکت علی رح اور مفتی کفایت اللہ رح کے اصرار پر ۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت کی، اس میں ان کا خطبہ نہ صرف سیاسی تھا، بلکہ علمی، تاریخی اور مذہبی رنگ بھی لیے تھا، جس کی وجہ سے یہ پورے عالم اسلام میں مشہور ہوا۔

جنوری ۳۷ء میں لکھنؤ کی نمائش گاہ میں ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس ہوئی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، اسی لیے اس نے اردو اور ہندی نام کے بجائے اپنا نام ہندستانی اکیڈمی رکھا تھا، مگر اس کانفرنس میں اردو اور ہندی کے دو خیمے علیحدہ علیحدہ کر دیے گئے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب رح

بڑا دکھ ہوا، اسی وقت ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، اور اس کا اظہار انھوں نے فروری ۳۷ء کے معارف میں بھی کیا، مارچ ۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کی طلائی جوبلی علی گڑھ میں ہوئی تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس میں خطبۂ صدارت کے لیے اپنا ایک مقالہ "عرب و امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا، اور اس میں یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہازران امریکہ پہونچ چکے تھے، کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی و فوقانی حصوں کا علم تھا، اسی لیے ماورائے ظلمت کی تہہ تک پہونچنے کی انھوں نے کوشش کی، ۳۸ء میں سی۔ پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم شروع ہوئی تو اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تو سید صاحبؒ نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن کو باقی رکھنے کے لیے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لیے قطعاً محال ہے،

۳۹ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد شایع ہوئی جس کی ضخامت ۸۸۸ صفحے ہے، اس وقت تک سید صاحب کی عمر پچپن ۵۵ سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کتاب کی ضخامت، اس کے اندر قلم کی روانی، تحریر کی شگفتگی اور مسائل کے نکتہ ورانہ اور دیدہ ورانہ مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی میں کہولت کے بجائے پہلے کی طرح رعنائی اور دلآویزی قائم اور برقرار تھی، انداز تحریر یہ بتاتا ہے کہ پہلے ہی کی طرح زبان کا تلاطم اور تموج باقی تھا، اور پھر اس تلاطم و تموج کے اندر سے ادب انشاء کے دربائے شہوار سطح پر آکر رولتے نظر آتے، طرز ادا میں فکر کی گہرائی کے ساتھ گیرائی بھی ہے، قلم میں متانت اور سنجیدگی پہلے سے اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس جلد میں اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے زیادہ بڑھا دیا ہے، اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی بات کہی گئی ہے اس کی تائید کے لیے قرآن کی آیتیں

اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور وہ اس لیے خشک نہیں ہونے پائی ہیں کہ رسول اللہؐ کی عملی زندگی کے واقعات اس کے ساتھ اس طرح پیش کر دیے گئے ہیں کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم پند و موعظت کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ لذیذ حکایتوں کی ایک کتاب سے لذت آشنا ہو رہے ہیں، یہ نہ صرف مسلمانوں کے خیر امت ہونے کے لیے ایک دستور حیات ہے، بلکہ اسلام کا رب، رب العالمین ہے، رب المسلمین ہی نہیں اور اس کے رسول بھی رحمۃ للمسلمین ہونے کے بجائے رحمۃ للعٰلمین ہیں، اس لیے مسلمانوں کے رب سے جو تعلیمات ملی ہیں، وہ انسانیت کا پیام رحمت اور انسانوں کے لیے نصاب زندگی ہیں اور ان ہی کو حاصل کر کے دنیا کی زندگی کے موتی، ہیرے اور لعل، سیرت کے یاقوت اور عقیق، کردار کے نیلم اور پکھراج اور لاجورد سے جگمگائی جا سکتی ہے،

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی اشاعت کے بعد سید صاحبؒ کا یہ سلسلۃ الذہب یہیں آکر ختم ہو جاتا ہے، آگے چل کر ان کے نام سے جلد ہفتم بھی شایع ہوئی، مگر وہ ان کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر وہ ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کی نجی اور عملی زندگی میں بعض اسباب کی بنا پر کچھ ایسا انتشار پیدا ہو گیا کہ وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، جو چند ابواب لکھے ہیں، ان ہی کو جمع کر کے شایع کر دیا گیا ہے، اس میں پہلے تو معاملات کے عنوان سے ایک مقدمہ ہے، پھر یہ عنوانات ہیں: (۱) اسلام میں حکومت کی اہمیت اور حیثیت (۲) عہد نبویؐ میں نظام حکومت (۳) سلطنت اور دین کا تعلق اور امت مسلمہ کی بعثت (۵) قوت عاملہ یا قوت آمرہ (۶) حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، ان چند ابواب سے سید صاحبؒ کے اسلامی سیاست کے افکار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور، موثر اور خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے وہ موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں کے لیے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظریں حکومت کے ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں، اور اسلام کی نظر اس کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل، یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب و تعیین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے، اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا طریقہ ہے"

سید صاحب ؒ کی علمی زندگی کا اصلی راس المال یہی سیرۃ النبی ﷺ کی جلدیں ہیں، ہمیں یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ ان میں وہ ابن اسحاق اور ابن ہشام سے بہت آگے ہیں، ان سیرت نگاروں نے زیادہ تر مغازی اور شمائل نبوی ﷺ پر زور دیا ہے، حضرت سید صاحب ؒ اپنی پانچوں جلدوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ سیرۃ النبی ﷺ کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی، ایسے مباحث کسی اور سیرۃ النبی ﷺ میں نہیں قلمبند کیے گئے، ان میں جب کبھی وہ قرآن مجید کی آیتوں کے رموز و نکات بیان کرتے ہیں تو ان میں امام رازی اور امام ابن تیمیہ کی روح حلول کر جاتی ہے، اور کبھی ان کی بعض گتھیوں کے سلجھانے میں شاہ ولی اللہ کی نگاہ ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی حدیث کی روایت و درایت کے پرکھنے میں ان کے سامنے ابن حجر عسقلانی نمودار ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تفسیر کبیر، تفسیر ابن جریر، تفسیر طبری اور تفسیر زمخشری کا وہ ذکر کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ماخذ کی نہیں بلکہ زیر مطالعہ کی رہتی ہے، اور وہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کے سمجھنے میں اپنے ہی ادراک و بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، جن کی روشنی ان کے قلم میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر پھیل جاتی ہے۔

ان ہی کارناموں کی بدولت انھوں نے جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، مگر اس لقب کے ساتھ انھوں نے ان جلدوں کے ذریعہ سے ان میں اپنی انشاپردازی کا جو قصر شیریں تعمیر کیا ہے، وہ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ ان میں جو انداز بیان ہے وہ دنیا کے کسی عظیم ترین مصنف کے اسلوب کے

مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے، کسی حسین صبح، کسی رنگین شام یا کسی عنبریں رات یا کسی گلشن کے گل و سرو و صنوبر کی منظر نگاری یا بلبل کی نغمہ سرائی، سبزہ زاروں کی لہلہاہٹ، دریا کی موجوں کی روانی، ایک عاشق نامراد کی تپش دل اور درد جگر یا کسی عیش کی محفل میں پروانوں کے ماتم کی مرقع آرائی کرنے میں قلم خوب رہبری کرتا ہے، مگر مفسر یا محدث یا فقیہ یا متکلم بن کر انشاپردازی کا جوہر دکھانا، یا نثر نگاری کی رنگارنگی کا اظہار کرنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، سید صاحب ؒ اسی تلوار کی دھار پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک بات یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مصنفوں کی کچھ قسمیں ہوتی ہیں، عنکبوتی، نملی، نحلی، عنکبوتی تو وہ ہیں جو عنکبوت یعنی مکڑی کی طرح اپنی تحریروں کے جالے تن کر اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں، نملی وہ ہیں جو اپنی تحریروں میں چیونٹیوں کی طرح ادھر ادھر سے اپنے خیالات کے ریزے جمع کر کے ایک انبار لگا دیتے ہیں، نحلی وہ ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی تحریروں میں خیالات کا شہد جمع کر دیتے ہیں، سید صاحب ؒ اپنی تحریر میں محقق بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، متکلم بھی ہیں، اپنی تحریر میں عنکبوتی نظر نہیں آتے، نہ محدث و مفسر بن کر نملی دکھائی دیتے ہیں، بلکہ محدث ہوں، مفسر ہوں، متکلم ہوں، یا فقیہ ہوں نحلی بن کر اپنے ناظرین کو یہ محسوس کراتے ہیں کہ اسلام علوم و فنون سے رس چوس کر اپنی میٹھی تحریر کے ذریعہ سے تحقیق، تفسیر، حدیث اور کلام کے شہد کا انبار ہی نہیں لگا دیتے بلکہ اس کا آبشار جیسے بار اور زود بار بہاتے رہتے ہیں۔

جس سال سیرۃ النبی جلد ششم شائع ہوئی اسی سال ان کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق ان کے قلم سے نکلے، ان کو پڑھ کر آج بھی اردو زبان کا بڑا سے بڑا ادیب، انشاپرداز اور نقاد اردو ادب پر ان کی گہری نظر کا قائل ہوگا، اس میں اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص بھی کی گئی ہے، اس کے آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ترقی کی تفصیلات بھی ہیں، اس کی بقا کی ضرورت اور اہمیت پر زور بھی ہے، اردو، ہندی اور ہندوستانی پر مباحث بھی ہیں، سنسکرت آمیز

ہندی کو راشٹریہ بھاشا بنانے کے خطرات کی تنبیہ بھی ہے، ہندی اور اردو کے ناگوار قضیہ کا بھی ذکر ہے، لکھنؤ والوں کی لسانی اور ادبی خدمات کا بھی ذکر ہے، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق بھی ہے، تہنید کے عنوان سے نہایت ہی دلچسپ لسانی گفتگو بھی ہے، اکبر کے ظریفانہ کلام کی نکتہ وری بھی ہے، مکاتیب شبلی پر گفتگو بھی ہے، کلام شاد پر تبصرہ بھی ہے، محبت کے متوالے، عشق حقیقی کے جویا، مجازی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنے والے جگر مرادآبادی کی شاعری کا تجزیہ بھی ہے، پھر گداز طبیعت رکھنے والے، ازل سے دردمند دل لے کر آنے والے، مزاج سدا کا اداس رکھنے والے، عالم کی نیرنگی، زمانہ کی سازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی دیکھ کر خود بھی اکثر رونے اور دوسروں کو رلانے والے حالی کی مسدس کی وہ آئینہ داری بھی ہے جس میں ہر مسلمان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔

سنہ [illegible] میں ان کا سفر دکن، سرحد، پنجاب میں ہوتا رہا جس میں وہ مسلمانوں کو شرف امم ہونے کی حیثیت سے خیر امم ہونے کا شوق دلاتے رہے، یہ گویا تبلیغی سفر تھا، اسی سال انھوں نے بچوں کیلئے رحمت عالم لکھی جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلعم کی سیرت پاک ہے وہ بچوں کیلئے لکھی گئی ہے لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں، اور اس وقت تک شاید لاکھوں کی تعداد میں شایع ہو چکی ہے

سنہ [illegible] میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، ان کی نجی زندگی بڑی پاک عاف رہی اور ان کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ غم ماند دم پاک ہے تو میری نظر میں۔ لیکن اپنی دینی عظمت و علمی جلالت کا لحاظ کیے بغیر حضرت مولانا تھانویؒ کے آستانہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم و فن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا، اسلام کے ایک سفیر اور ضمیر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی، عبادت و ریاضت میں ذکر خفی اور جلی بھی ہونے لگا، ان کی تقریر و خطابت میں علمی و تاریخی رنگ کے بجائے تبلیغی انداز پیدا ہو گیا، زیادہ وقت رشد و ہدایت میں

صرف ہونے لگا، پہلے کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، اب عارفانہ و صوفیانہ رنگ کے اشعار اور غزلیں زیادہ کہنے لگے، اس زمانہ میں ان کی طبیعت کا رنگ ان دو شعروں سے ظاہر ہوگا۔

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے
وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

خیالِ دورروزہ کا کیا عیش و غم
سفر کا بھی کیا۔ جیسے تیسے رہے

مگر اس رنگ کے باوجود ان کے اپنے استاد کی اس وصیت کا خیال برابر غالب رہا کہ جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا، سنہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا تھا، اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد سنہ ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی حیات شبلی لکھ کر اہل علم کے سامنے پیش کی، یہ ایک جلیل القدر عالی مرتبت اور شفیق استاد کی خدمت میں ایک فاضل شاگرد کی دلی محبت، شیفتگی، فریفتگی، وارفتگی کا نذرانہ ہے، اس میں مولانا شبلیؒ کے علمی کمالات و اجتہادات اور ان کے زمانہ میں تمام تعلیمی، اصلاحی، ملی اور قومی تحریکوں میں ان کی دلچسپیوں کا ایسا دلکش مرقع کھینچا ہے کہ ان کے نہ صرف خط و خال نمایاں ہو گئے ہیں بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی واقعات کی تاریخ بھی قلمبند ہو گئی ہے، اس کے مقدمہ میں یوپی کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی جو علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی تاریخ لکھی گئی ہے، وہ اس کتاب کا شاہکار ہے،

ان کی طبیعت کا رنگ بدل جانے کے باوجود ملک کے ہر حصے سے ان کے پاس علمی، تاریخی، اور مذہبی جلسوں کیلئے دعوت نامے آتے رہے، سنہ ۱۹۴۴ء میں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کا جلسہ مدراس میں ہوا، تو ان کو شعبہ تاریخ ہند ازمنہ وسطی کی صدارت کیلئے دعوت دی گئی، اس میں انھوں نے جو خطبہ دیا، وہ مورخوں کیلئے شمع ہدایت ہے، اس میں انھوں نے مورخوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جو دل ان سے ٹوٹے وہ اب تک نہ جڑ سکے، لیکن اب جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے، اور اس حالت میں جبکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اس طرح پلتا اور بڑھتا رہے اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے"

"...... ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کیلئے یہ کوشش جاری ہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے"۔

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات ویشادرم، عمرآباد میں مذہبی تقریریں کرتے ہوئے بمبئی پہونچے، وہاں جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورہ الحجرات کی تفسیر شہر کی انجمن اسلام ہال میں 'اردو' اور صابو صدیق ہال میں 'ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت' اور ایک خاص مجمع میں 'توبہ و انابت' پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد ندوۃ العلماء کے کام سے گئے اور وہاں سے گاندھی جی نے ان کو واردھا بلایا، وہاں جو جلسہ ہوا تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہیے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں ہے، اسی لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد لفظوں کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے، اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے اسی کو برقرار رکھنا چاہیے"۔

اسی کی ترویج وہ زندگی بھر کرتے رہے، اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اسی سفر میں وہ راندیر اور سورت گئے، اور راندیر کی جامعہ حسینیہ میں الجہد والجہاد العلمی المعاش والمعاد کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسہ اشرفیہ میں خشیت الٰہی پر ایک خطبہ دیا۔

وہاں سے واپس آئے تو بہت سخت علیل ہو گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹروں نے علمی کام چھوڑ دینے کو کہا مگر عمر بھر کی اس عادت کا چھوٹنا مشکل تھا، معارف کے لیے شذرات لکھتے رہے، جس میں دینی اور ملی احیاء کی تلقین کے ساتھ تجدد اور تفرنج دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ ان کی زندگی کے رگ و ریشہ میں رچا بسا ہوا تھا، زندگی بھر اس کے لیے مفید کام انجام دیتے رہے،

آخر میں وہیں منتقل ہو جانے کا خیال تھا لیکن نواب حمید اللہ نے اصرار کر کے بھوپال بلا لیا، تاکہ وہ ریاست کے دار القضا اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں،

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں بڑا انقلاب آگیا، دیسی ریاستوں کے لیل و نہار بھی بدل گئے، وہاں کے قیام کے زمانہ ۱۹۴۹ء میں حج کے لیے گئے، مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، اور بارگاہ نبوی کے سیرت نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، لطف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا،

۱۹۴۷ء کے بعد وہ کوئی مستقل مضمون نہ لکھ سکے، معارف میں وفیات کے عنوان سے کبھی کبھی لکھے، یا شذرات لکھ بھیجتے، جون ۱۹۵۰ء میں معارف میں ان کے آخری شذرات شایع ہوئے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعی ضروری نہیں کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں"۔

یہ گویا ہندوستان والوں کے لیے ان کا آخری پیغام تھا،

وہ جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہونچ گئے، کیوں گئے؟ کیسے گئے؟ اس کی بڑی دردناک کہانی ہے، وہاں پہونچ کر اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۱ء میں راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلائے سے نہیں بھولتا، ..... خدا جانے چمن پہ کیا گذری!"

کراچی ہی میں ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، پاکستان میں ان کی مشغولیتوں اور سرگرمیوں کو سردست نظر انداز کیجئے۔

ان کی زندگی پر یہ محض ایک طائرانہ نگاہ ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہو گا کہ ان کی زندگی

علم و فن کی اضطراری، اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا ایک پیکر بنی رہی، جس میں حرکت، سرگرمی اور کثرت کار ایسی کار فرما رہی کہ یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کی لازم و ملزوم بنی رہیں، شاید ہی ان کا کوئی دن یا کوئی گھنٹہ بیکار گذرا ہو، وہ لکھتے نہیں تو کچھ پڑھتے، اور اگر لکھتے پڑھتے نہیں تو کچھ سوچتے، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ خالد بن ولیدؓ کی طرح علم کے میدان کارزار میں اترے، سعد بن ابی وقاصؓ کی طرح اقلیم علم کی فتوحات کیں، عبیدہ ابن جراحؓ کی طرح علم کے قلعوں کے کنگروں پر اپنا پرچم لہرایا، معاذ بن جبلؓ کی طرح علمی خطہ پر فرماں روائی کرنے میں قرآن اور حدیث کو سینے سے لگا کر اپنی اصابت رائے سے علمی اجتہادات بھی کیے ہندوستان میں اپنی قلمی رواداری اور علمی فراخدلی دکھا کر علم و فن کے محمد بن قاسم بھی بنے رہے۔

۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کا جنازہ کراچی میں اٹھا تو اس کا آنکھوں دیکھا حال وہاں کے ریڈیو سے نشر کیا جا رہا تھا، دار المصنفین کے لوگ اس کو سن رہے تھے تو ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسلام کا ایک تابندہ ضمیر اور بے چین سفیر اپنے علم کی گہرائی، فن کی دیدہ وری، تحقیق کی گہرائی، قلم کی شگفتگی، تحریر کی زور بیانی، طرز ادا کی دلنشینی اور انداز بیان کی خوبی کے ساتھ سپرد خاک ہو رہا ہے، دار المصنفین کے لوگ اب تک دلگیر ہیں کہ بزم شبلی کا صدر الصدور اس کی علمی مجلس کا سرور جب سے ان سے رخصت ہوا تو ان کے ساتھ یہاں کی علمی سحر کی سپیدی اور علمی شام کی رنگینی بھی چلی گئی، انھوں نے ایک علمی تاج محل بنایا جس پر وہ چودھویں رات کی چاندنی کی طرح پھیلے رہے، وہ گئے تو پھر اس پر وہ چاندنی چھٹکی ہوئی نہیں دکھائی دی، ان کی یاد میں جب آنسو کے قطرے گرتے ہیں تو اس کا ہر قطرہ یہ کہتا ہوا گرتا ہے کہ

ع ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے
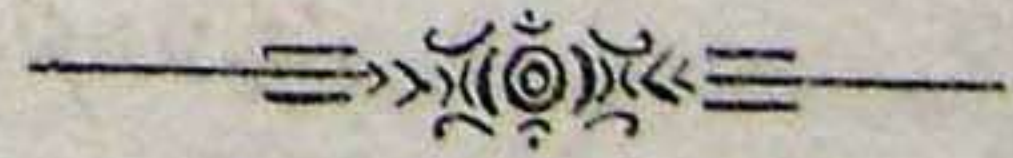
تاریخ اسپین کا ایک ورق

از

ڈاکٹر صلاح الدین ندوی، قاہرہ،

تاریخ کی تند و تیز گردش کے باعث کچھ شخصیتیں پس پردہ ہو جاتی ہیں یا قصداً ان پر نقاب ڈال دی جاتی ہے، پھر کچھ دیگر شخصیتیں تاریخ کے صفحات پر رونما ہوتی ہیں، مگر وہ اپنی کم مائیگی کے باعث اس دنیا کو کچھ نہیں دے سکیں، بلکہ ان کی خوں ریز اور انسانیت سوز بد اعمالیوں کے نتیجے میں ان کے روئے سیاہ بشریت کی تاریخ میں شامل کر تو لیے گئے، لیکن درحقیقت وہ انسانیت کی سفید پیشانی پر سیاہ دھبے ہیں،... بہرحال ہم اس تحریر میں اُن بہادروں کے عزائم اور عظیم الشان کارناموں پر روشنی ڈالنے جا رہے ہیں جنھیں مصلحت خسرواں نے ابھرنے نہ دیا، اور جنھیں غیر منصف مزاج مورخین نے بالقصد نظر انداز کر دیا ہے۔

قارئین! اسپین کے عرب بہادروں کی عظیم الشان داستان کا آغاز اس خبر سے ہوتا ہے جو سائوتیں دہائی میں قاہرہ سے شایع ہونے والے ایک مشہور و مقبول روزنامہ "الجمہوریۃ" میں شایع ہوئی تھی اس خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسپین کی کسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ایک امریکی طالب علم عربوں اور مسلمانوں کی تاریخ کی جستجو میں تھا، اسے جزیرۂ ٹرینڈاڈ میں ایک قدیم کھوکھلے درخت کے اندر عربی زبان میں نوشتہ ایک مخطوطہ دستیاب ہوا، اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس امریکی طالب علم نے اسے اپنے ایک مستشرق استاذ کے سامنے پیش کیا، اس امید پر کہ اس کے تاریخی حقائق کچھ روشنی میں

آجائیں گے، مگر اس کے مستشرق استاد نے بھی اس تاریخی حقایق سے لاعلمی کا اظہار کیا، چنانچہ انھوں نے اس مخطوطہ کو قدیم تاریخی مصادر اور دستاویزات پر اہتمام سے تحقیق کرنے والے ایک غیر ملکی تحقیقاتی ادارہ کے حوالہ کر دیا۔

وہ امریکی طالب علم اور اس کے وہ مستشرق استاذ اچانک اسپین سے روپوش ہو گئے، یا کر دیے گئے، پھر ان کا کہیں پتہ نہ مل سکا، وہ دونوں کہاں گئے، انھیں زمین کھا گئی، یا آسمان نگل گیا، عالمی صحافت اس عربی مخطوطہ کی تہ تک پہونچنے کے لیے بحث و مباحثہ اور تحقیقات کرنے لگی۔

اس مخطوطہ میں ایک بہادر عرب شہسوار مرسی بن ساطع کی بہادری کی داستان ہے۔

عرب شہسوار مرسی بن ساطع ایک اسلامی مجاہد تھا جس نے اپنی ہی جیسی چند غیر معروف بہادر شخصیتوں کے باہمی تعاون سے ایک جدید سلطنت اسلامیہ کی بنیاد رکھنے یا جزیرہ ٹرینیڈاڈ میں ایک دوسری اندلسی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

مذکورہ بالا مخطوطہ میں اسی ابن ساطع کی یہ تحریر ہے:

"اے ابن قتیبہ! بخدا میں تمھاری یاد میں تمھاری قبر پہ یہ عبارت تحریر کرنے کی کتنی تمنا رکھتا تھا کہ (اس دور افتادہ مقام پہ ایک ایسا انسان محو خواب ہے جسے اس کے عقیدے نے مار ڈالا، جس پہ وہ شدت کے ساتھ ایمان رکھتا تھا ..... وہ شہید ہو گیا..... مگر عقیدہ باقی ہے اور تا ابد زندہ و جاوید رہیگا) لیکن میں جسے لوگ مرسی بن ساطع کہتے ہیں کون میری قبر پہ کچھ لکھے گا؟ کون؟ کون؟"..... ابن ساطع۔

ان ہی کلمات کے ساتھ اس عرب شہسوار مرسی بن ساطع نے جس سمندر میں اپنا گھوڑا دوڑایا تھا، اپنے اس مخطوطہ کی عبارت ختم کر دی ہے، اس کے بعد اس نے اپنے زخموں سے نڈھال

جسم کو زمین پر ڈال دیا، اور بیہوش ہو گیا، اور جب دوبارہ ہوش و حواس میں آیا تو اس نے خود کو جزیرۂ ٹرینیڈاڈ کے چند باشندوں کے ہاتھوں میں پایا، ہوش میں آتے ہی اس نے یہ دریافت کیا کہ "کیا ہوا؟ کیا سبھی مر گئے؟ کیا ہر شے مٹ گئی؟ دنیا بیحد ظالم ہے، بیشک خدا گواہ ہے کہ میں نے کوشش کی اور میرے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی تعاون کیا،... برق جیسی تیز رفتاری کے ساتھ حوادث گذر گئے،... مجھے اپنی خبر نہیں،.... اے مجاہدین شہدا! بخدا تمھاری یاد میں یہ میں تحریر کر رہا ہوں کہ تمھاری قبریں جو تمھاری شہادت کی خونیں داستان کی گواہ ہیں، چیخ چیخ کر ظلم و ستم اور جابرانہ سرشت کی مذمت کریں گی۔"

پھر ابن ساطع نے اپنی آنکھیں ان لوگوں کے چہرے پر گاڑ دیں جو اس پاس ہی کھڑے تھے، اس نے ان لوگوں کے چہروں پر رنج و الم اور حزن و ملال کے گہرے تاثرات دیکھے، ان کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں، ہر جگہ تباہی و بربادی سی تھی،.... ابن ساطع نے ان لوگوں سے درخواست کی کہ "جہاں پہ میرا دوست ہانی بن قتیبہ جو زندگی بھر میرے ساتھ رہا، دفن کیا گیا ہے وہیں مجھے منتقل کیا جائے۔"

ابن ساطع نے ان لوگوں کو وصیت کی کہ وہ ان کے اس مخطوطہ کو کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیں جسے انھوں نے تاریخ کے لیے لکھا ہے۔

ابن ساطع نے پھر کہا کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے برسوں کے بعد اس تاریخی دستاویز کی بازیابی ممکن ہوگی، میں نے یہ مخطوطہ اپنے خویش و اقارب کے لیے لکھا ہے.... اپنے عرب خاندانوں کے نام لکھا ہے.... جو اس بحر بیکراں کے اس طرف رہتے ہیں... تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ میں اور کتنے ہی میرے مسلمان بھائی بہن ایک ایسی دور افتادہ پاک سرزمین پہ زندگی گذارنا چاہتے تھے جہاں پہ خدا تعالیٰ کی برحق شریعت کا نفاذ ہو، اور ہم خون و جنگ اور نفرت سے

دور، بہت دور پُرامن زندگی بسر کر سکیں۔"

اس تحریر کے لکھنے کا جو سبب ہوا، اس کے لیے یہ تاریخی واقعات جاننے کی ضرورت ہے:

اسپین میں فرنگی ظلم وستم سے تنگ آکر ہزاروں مسلمان وہاں سے فرار ہوگئے تھے، اور نجات کے لیے کوئی ایسی مامون جگہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں پر انھیں اس وقت تک پناہ مل سکے جب تک ان کی مشکلات کا کوئی حل نہیں نکلتا، کیونکہ شاہ فرڈیننڈ کی ظلم وزیادتی کے باعث سرزمین اندلس ان کے لیے تنگ ہوگئی تھی، وہاں پر زندگی کی تمام راہیں ان کے لیے مسدود نظر آتی تھیں، انجام کار ہزاروں مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی، اور اس دور افتادہ جزیرہ پر قدم رکھا، اس امید پر کہ یہ باقی ماندہ مسلمان جو موت کے منھ سے بچ نکلے ہیں، اپنی قوت کو یکجا کرکے اپنی ہستی قائم رکھ سکیں اور پُرامن زندگی گذار سکیں۔

ان ہی میں ابن قتیبہ تھا، جو اپنے مذہب پر پختہ عقیدہ رکھتا تھا، اسے یہ توقع تھی کہ کسی امن پسند طاقت یا مشرق کے مسلمانوں سے اس کو مدد مل جائیگی، اور وہ ایک ایسا جہان تعمیر کرلے گا جو سرزمین اندلس کی مانند بن سکے یا گمشدہ اندلس کا نعم البدل ثابت ہوسکے، وہ ٹرینڈاڈ پہونچا، لیکن فرنگیوں نے ہر جگہ اندلس کے مسلمانوں کا تعاقب کیا، تاکہ وہ کہیں متحد نہ ہوسکیں، یہ بھیڑیے اپنے خون کی پیاس بجھانے کے لیے جزیرۂ ٹرینڈاڈ پر چڑھ دوڑے، انھوں نے بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں سب کو بلا امتیاز مار ڈالا، جب کہ وہ بھی انسان تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے۔

مرسی بن ساطع بھی ان ہی میں تھا، وہ زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا، اس کو جب ہوش آیا، تو اس کے خواب کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔

جزیرے کے جو مسلمان باشندے اُن انسانی بھیڑیوں کے ہاتھوں سے بچ گئے تھے، انھوں نے مرسی بن ساطع کو بتایا کہ شہداء کی اسلامی طرز پر تدفین کی گئی ہے، تو انھیں کچھ قلبی سکون میسر ہوا۔

پھر مرسی بن ساطع اس جزیرہ میں تنہا ہی افتاں وخیزاں اِدھر سے اُدھر سرگرداں وپریشان رہا، دراصل تنہائی میں وہ ایک تحریر لکھ رہا تھا، جو تاریخی حقایق پر مشتمل تھی، اس نے اپنے مخطوطہ میں یہ لکھا کہ:

"اے تاریخ! میں تجھے گواہ بناتا ہوں، تو اس بات کی گواہی دینا کہ میں نے اپنے رفقاء مجاہدین کے ساتھ بھیڑیوں کے بھٹ میں ایک پرامن جہان تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی،..... مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک سراب تھا!"

اور پھر ابن ساطع وہیں ہانی بن قتیبہ کی قبر پر گر پڑے اور ان کی روح جسد خاکی سے پرواز کرگئی، مگر ابن قتیبہ کی قبر زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی، کہ "نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، اے ابن ساطع وہ سراب نہ تھا بلکہ راہ خدا میں ایک جہاد تھا۔"

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں "ملتقی ادب اسلامی"

از

عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

ندوۃ العلماء نے آج سے کوئی چار برس پہلے اپریل ۱۹۸۱ء میں اسلامی ادب پر ایک بین اقوامی کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں عالم اسلام سے آئے ہوئے نمایندوں نے اپنی تقریروں اور مقالات کے ذریعہ ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اس کانفرنس نے دنیائے اسلام کے دانشوروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ادبی اجتماع میں ندوہ کی ان کوششوں کو سراہا گیا، مئی ۱۹۸۴ء میں مصر، سعودی عرب اور یمن کے اہل علم ادیبوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی حجاز میں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایک ادبی نشست رکھی، جس میں "رابطۃ الادب الاسلامی" کے نام سے مستقل انجمن کے قیام پر اس کے مستقل صدر کی حیثیت سے مولانا ندوی کے نام پر اور مستقل مرکز کی حیثیت سے ندوۃ العلماء میں اس کے صدر دفتر کے قائم کیے جانے پر اتفاق کیا گیا، اور یہ بھی طے ہوا کہ فروری یا مارچ ۱۹۸۶ء میں رابطۃ الادب الاسلامی کی طرف سے ندوہ میں ایک دوسری بین اقوامی کانفرنس منعقد کی جائے، کانفرنس کے اغراض ومقاصد کا بھی تعین کیا گیا۔

رابطۃ الادب الاسلامی کے اغراض ومقاصد کے تعارف اور ہندوستان میں ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی طرف سے

۱۰، ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء کو ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں ایک مجلس مذاکرہ ہوئی، جسے ملتقی ادب اسلامی کا نام دیا گیا، بحث ومناقشہ کے لیے تین موضوعات متعین کیے گئے:

(۱) ادب اسلامی میں سوانحی ادب کے مسائل ومعیار۔

(۲) ادب اسلامی میں تنقیدی قدریں۔

(۳) ادب اسلامی میں افسانوں اور کہانیوں کے حدود وامکانات۔

اس کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، دار المصنفین اعظم گڈھ، لکھنؤ یونیورسٹی، فلاح دارین سورت، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف فارن لنگویجز حیدرآباد، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نمایندوں نے شرکت کی، پہلی نشست کا آغاز ۱۰ اپریل کی صبح کو ۱۰ بجے تلاوت کلام پاک سے ہوا، سکریٹری ادب اسلامی مولانا محمد رابع ندوی کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے اجلاس کی نظامت مولانا نور عظیم ندوی کے سپرد ہوئی، جس سے وہ بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے، انھوں نے سکریٹری رابطہ کی مرتب کردہ رپورٹ پڑھ کر سنائی، جس میں رابطۃ الادب الاسلامی کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کے ساتھ ہی ادب اسلامی کے بارے میں چند غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی تھی، ۱۹۸۱ء سے لے کر اب تک رابطہ کی کارکردگی کا جائزہ اور اسکی طرف سے شایع ہونے والی کتابوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی ادارہ کے ایک شعبہ کے طور پر ادارۂ صحافت اسلامیہ کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، جس کی طرف سے ہندوستان اور عالم اسلام کی ادبی وثقافتی خبریں اور فیچرس اردو اور عربی اخبارات کو فراہم کیے گئے۔

رپورٹ کے بعد صدر اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "شعر وادب کو نیا رخ

دیے میں اقبال کا تاریخی کردار" کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ مقالہ دراصل اس تقریر کا ترجمہ ہے جو ابھی کچھ ہی دنوں قبل مسجد نبویؐ کے متصل مدینہ طیبہ میں ادیبوں اور دانشوروں کے ایک اجتماع میں کی گئی تھی، اس میں ادب اسلامی کے امتیازی پہلوؤں پر بھی گفتگو تھی۔

بعد ازاں محترم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین نے اختصار کے ساتھ "ملتقی" کے تینوں موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور یہ بتایا کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں تنقید ادب اور سوانح نگاری پر جو کام ہوا ہے وہ اپنے معیار و مباحث، اپنے اسلوب اور انداز تحقیق کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، خاص طور پر علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی کتابیں اس بارے میں کام کرنے والوں کے لیے دلیل راہ ہیں، افسانوی ادب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے ہندوستانی علماء کے قائدانہ کردار کی تعریف کی، اور یہ بھی فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری وغیرہ نے ناقابل فراموش کردار دیے ہیں اور نئے افسانہ نگار اپنی فنی مہارت اور وسعت مطالعہ کے جتنے بھی دعوے کریں وہ ابھی تک ایسے کردار نہیں دے سکے جن کو پڑھنے والے یاد رکھ سکیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ادب میں اسلامیت اور اخلاقی قدروں پر زور دیا، اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر راشد ندوی نے تفصیل کے ساتھ ہندوستان میں عربی ادب کا جائزہ لیا اور یہ وضاحت کی کہ ہندوستان کے عربی ادیبوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے عربی نثر نگاری کا ایک خاص اور ممتاز اسلوب دیا، جس کی بہت سے عربی ادیبوں اور انشاء پردازوں نے بھی پیروی کی ہے، اسی طرح انھوں نے عربی لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کر دی ہے۔

دوسرا اجلاس ملتقی کا دوسرا اجلاس شام ۷ بجے ہوا، اس کا موضوع تھا "اسلامی ادب میں سوانح نگاری"

سب سے پہلے نور عظیم ندوی صاحب نے ناظم اجلاس کی حیثیت سے اس موضوع کی اہمیت، فن سوانح نگاری میں مسلمانوں کے کارناموں اور سوانح نگاری کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالی، اس کے بعد مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی صدر شعبۂ دینیات دارالعلوم ندوہ نے سیرت و سوانح نگاری اور ادب کے باہمی رشتہ و تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ سوانح نگاری میں اگر زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں تو وہ ادب ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتابوں کا حوالہ دیا جو سوانحی ادب کے بہترین نمونے ہیں، جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (ناظم دارالمصنفین) نے ایک بار پھر بحث میں حصہ لیا، اور ادیب اور انشاء پرداز کے بارے میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے یہ بحث تشنہ رہ گئی، ڈاکٹر یٰسین مظہر ندوی (ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو اسلامی ادب میں سوانح نگاری اور اس کے مسائل کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، موصوف نے شخصیت کی تعمیر میں تاریخی عناصر کی اہمیت پر زور دیا، انھوں نے ناقص یا نامکمل معلومات کی بنیاد پر سوانحی خاکہ مرتب کرنے پر سخت تنقید کی، اسی طرح جانب داری اور غیر معروضی نقطۂ نظر سے بھی جس میں کبھی تو بے جا مدح و تحسین کی جاتی ہے اور کبھی طعن و تشنیع کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، اپنی بیزاری کا اظہار کیا، ان کے نزدیک یہ بھی درست نہیں کہ چند جزئی واقعات کی بنیاد پر کوئی اصول تجویز کر لیا جائے، یا چند روایتوں کی بنیاد پر تعمیم کا رویہ اختیار کیا جائے، سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں مآخذ کے انتخاب کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے، اس لیے قدیم ترین مآخذ کی طرف رجوع ضروری ہے، بعد کے مآخذ پر اعتماد کو سہل نگاری کی علامت سمجھا جانا چاہیے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے اسلامی ادب میں سیرت و سوانح نگاری کی ایک اہم کتاب "الشفا" مؤلفہ قاضی عیاض پر مقالہ لکھا تھا، مگر وقت کی کمی کی وجہ سے انھوں نے اس کے

اقتباسات سنائے، اس کتاب کے تاریخی اور ادبی امتیازات کی نشاندہی کی، اور اس کے ماخذ کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی۔

اس دوسرے اجلاس کے آخر میں صدر جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی زیر طبع کتاب "شخصیات وکتب" کے مقدمہ کا خلاصہ بیان کیا جس میں انھوں نے سوانحی شخصیتوں سے متعلق تاریخی عوامل پر نظر رکھنے اور دوسرے آداب تحقیق کا لحاظ کرنے کے ساتھ ہی زیر بحث شخصیت کیساتھ جذباتی وابستگی اور ذوقی مناسبت کی اہمیت کو واضح کیا، اور یہ بتایا کہ اس کے بغیر تحریر میں گرمی اور قوت پیدا نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس کے بغیر تلاش اور تحقیق کی دشوار گذار گھاٹیوں کو طے کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا اجلاس اس اجلاس کا موضوع "اسلامی ادب کے لیے تنقیدی قدروں کی تلاش و جستجو تھا،

۱۱ اپریل صبح ۸ تا ½۱۰ بجے کے اس اجلاس میں سب سے پہلے تو مولانا نور عظیم ندوی نے ادب میں تنقیدی قدروں پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ اسلامی نظریۂ ادب اور تنقیدی قدریں ادب میں ایک نئی قوت اور نیا اعتماد فراہم کر سکتی ہیں، جن کی تلاش کے لیے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں، اس کے بعد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے اپنا مقالہ "اسلامی ادب میں تنقید کا معیار" پڑھا جس میں انھوں نے ادب کے مختلف اسکولوں کے معیار نقد ونظر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ ادب کو متعدی اور مذہبی اور اخلاقی قدروں کا تابع ہونا چاہیئے۔ مقالہ کی صدر اجلاس نے بطور خاص تحسین فرمائی۔

اسلامی ادب میں تنقید سے متعلق ایک مقالہ ڈاکٹر راشد ندوی صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تھا جس کے اہم نکات انھوں نے زبانی بیان کیے، ان کے خیال میں زمانۂ جاہلیت یا عہد صحابہؓ میں تنقیدی اصول وضوابط کا وجود نہیں ملتا، انھوں نے عہد اموی وعباسی کا جائزہ لے کر یہ بتایا کہ تنقیدی فلسفہ، نظریات اور مدارسِ نقد بعد کی پیداوار ہیں، اور آج ہمارے زمانہ میں ایسے ادبی

وتنقیدی مکاتبِ فکر موجود ہیں، جو خیر کے بجائے شر کی اشاعت کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں ادب کو صحیح رخ پر لانے کے لیے اسلامی ادب کی قدروں اور معیاروں کی تلاش اور تعیین کی ضرورت پیش آرہی ہے۔

مذکورۂ بالا مقالہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا ابوالعرفان ندوی استاذ دارالعلوم ندوہ نے کہا کہ یہ کہنا محل نظر ہے کہ دور جاہلیت یا اس کے بعد عہد اموی اور اوائل عہد عباسی میں تنقید کے نمونے نہیں ملتے، انھوں نے بعض اہم ادبی کتابوں کے حوالہ سے متعدد شعراء کے اشعار اور ان پر ارباب ذوق کی تنقیدوں کے نمونے پیش کیے، ڈاکٹر راشد ندوی نے اپنے مقالہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی فلسفہ یا ادبی مکتبِ فکر کی تابع تنقید کا نمونہ موجود نہیں تھا، ورنہ اس دور میں ذوقی تنقید کے نمونے تو بکثرت مل جائیں گے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پروفیسر سید ابراہیم ندوی نے "النقد الاسلامی" کے عنوان سے اپنا مقالہ عربی میں تیار کیا تھا، مگر چونکہ اب تک ملتقی کے تمام مقالے، تقریریں، اور مناقشے اردو میں تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مضمون کا خلاصہ اردو میں پیش کیا، جس میں عہد اسلامی میں تنقید اور اس کی خصوصیات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا،

اس مجلس کے آخر میں راقم الحروف نے اپنے زیر ترتیب مقالہ کے اہم نکات پر زبانی گفتگو کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ادبی اور تنقیدی قدریں ہمیں قرآن مجید اور حدیث شریف ہی سے اخذ کرنا چاہیے، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دور جاہلیت کے بعد جس ادب کی اساس رکھی اس میں ادب کے معیار ومقصد اور اسلامی ادب کی تنقیدی روایات کا بھی تعین کیا گیا ہے، دور جاہلیت میں صرف حسن ہی کو نقد ونظر کے واحد معیار کی حیثیت حاصل تھی، اس کے ساتھ ہی حکمت کو بھی کبھی اہمیت دے دی جاتی، لیکن صداقت کو تنقید ادب میں متفقہ معیار کی حیثیت

حاصل نہ تھی، اسلامی ادب نے حسن، صداقت اور خیر کو تنقید ادب کی اساس قرار دیا جس میں مسرت، بصیرت اور افادیت کا پہلو بھی ہو، اس بارے میں ارشادات رسول ؐ سے ہمیں واضح طور پر رہنمائی ملتی ہے، چنانچہ مختلف تنقیدی اصول و روایات کا ذکر کرنے کے بعد ہر ایک کی قرآن و سنت رسول ؐ سے مثالیں بھی پیش کی گئیں۔

اسی نشست میں تجاویز اور سفارشات مرتب کرنے کیلئے کمیٹی بنا دی گئی کہ اچانک دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک سابق استاد اور ادیب مولانا عبدالماجد ندوی کے جدہ میں انتقال کر جانے کی خبر ملی، چنانچہ تجاویز میں تعزیت کی تجویز کا اضافہ کیے جانے کی سفارش کی گئی اور اس نشست کا اختتام ہوا۔

چوتھا اجلاس نصف گھنٹے کے وقفہ کے بعد چوتھا اور آخری اجلاس ہوا، جس میں جناب سید حامد حسن صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس ملتقی میں اب تک زیر بحث آنے والے مسائل پر بلیغ اسلوب میں اظہار خیال کیا، انھوں نے اسلامی ادب میں کہانیوں کے موضوع پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تعمیری انداز کی حامل معیاری کہانیوں کی ضرورت سے انکار کی مجال نہیں، انھوں نے خاص طور سے بچوں کیلئے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کیا اور عربی مدارس کے بارے میں چند مشورے بھی دیے۔

آخر میں صدر اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ادیب اور انشا پرداز کے فرق کے مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے یہ فرمایا کہ مولانا شبلی ادیب اور انشا پرداز دونوں تھے اور ان سے بہتر اسلوب اب تک ہم کو کوئی نہیں دے سکا، مولانا نے اجلاس کے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا، اجلاس میں پیش کردہ تجاویز باتفاق آرا منظور ہوئیں، ملک کے اہم اخبارات نے اجلاس کی پوری کارروائی کی تفصیل دیتے ہوئے ان تجاویز کو بھی شایع کر دیا ہے اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یہ واضح رہے کہ ملتقی ادب اسلامی کی یہ نشست رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے اس کی بین اقوامی کانفرنس کی تمہید کے طور پر منعقد کی گئی تھی اور توقع ہے کہ ادب اسلامی کی یہ بین اقوامی کانفرنس شایان شان طریقہ سے ندوہ ہی میں فروری یا مارچ ۸۶ء کو ہوگی۔

وفیات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رحلت

از ڈاکٹر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

علم و حکمت کا وہ آفتاب جو گذشتہ نصف صدی سے برصغیر پاک و ہند کو منور کر رہا تھا، مورخہ ۲۴ر مئی مطابق ۳ر رمضان المبارک بروز جمعہ افطار سے تھوڑی دیر پہلے غروب ہوگیا، یعنی حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی علالت کا سلسلہ طویل رہا، گذشتہ سال مئی کے وسط میں حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی کا انتقال ہوا تو ان پر اس سانحہ کا بڑا اثر ہوا، اس کے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید آناً فاناً وفات پا گئے، ان کی طبیعت پر اس کا بھی بڑا اثر ہوا، بیٹے کی وفات کے روز انھوں نے ان کو کسی وجہ سے خوب ڈانٹا تھا، وہ گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے، مولانا کا خیال ہے کہ اس روز آزردہ ہو کر انھوں نے مقررہ مقدار سے زائد گولیاں کھا لیں، اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگے تھے، گذشتہ اگست میں میرے قیام علی گڑھ کے دوران میں انھیں کتے نے کاٹ لیا، ڈاکٹر نے ان کے شکم میں متعدد انجکشن لگائے، لیکن چند روز بعد وہ جگہ متورم ہو گئی اور انھیں بخار آنے لگا، ڈاکٹروں نے ملیریا بخار کی تشخیص کی اور انھیں کونین کھلانا شروع کر دیا، ضرورت سے زیادہ کونین کے استعمال سے ان کا جگر خراب ہو گیا، اور خون پیدا ہونا بند ہو گیا، خرابی جگر سے یرقان ہو گیا، علی گڑھ یونیورسٹی کے ہسپتال میں بغرض علاج داخل ہو گئے، لیکن افاقہ نہ ہوا، حکیم انعام اللہ خاں صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کے بھی زیر علاج رہے، لیکن کمزوری دن بدن بڑھتی چلی گئی، ان کی علالت بڑھتی گئی ان کی بیٹی مسعودہ سعید کراچی سے علی گڑھ پہونچیں اور ہفتہ عشرہ میں تمام انتظامات کر کے انھیں اپنے ساتھ کراچی

لے آئیں، کراچی میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے ان کا معائنہ کیا، حکیم محمد سعید صاحب نے تمام رپورٹیں ملاحظہ کر کے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا، ان کے شانے میں پتھری پیدا ہو چکی تھی اور متاثرہ جگہ پر سرطان نمودار ہو گیا تھا، جسمانی کمزوری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ مرحوم آپریشن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، میں وسط اپریل میں ان کی عیادت کیلیے کراچی گیا، چھ روز ان کے پاس ٹھہرا، لوٹتے وقت دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں یہ انکے ساتھ آخری ملاقات نہ ہو،

۲۴ مئی کو افطار سے ذرا قبل موصوف غسل خانے سے وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ ہی میں حرکت قلب بند ہو گئی، لاہور میں یہ اطلاع عشاء سے قبل ملی بھاگ دوڑ اور سفارشوں کے بعد ہوائی جہاز میں ایک سیٹ مل سکی، میری اہلیہ ان کے آخری دیدار کے لیے پہلے ہی کراچی پہونچ چکی تھیں۔

۲۵ مئی کو دوپہر کے وقت ان کے جنازہ کی نماز ہوئی، جس میں کراچی کے علماء، اہل علم اور عمائدین نے شرکت کی، گورنر سندھ کی نمایندگی ان کے اے ڈی سی نے کی اور ان کی طرف سے پھولوں کی چادر چڑھائی۔

ان کو دارالعلوم کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطہ قبور میں ان کے قریب ہی ابدی آرام کیلیے جگہ ملی ہے، اس مختصر سے قبرستان میں صرف علماء و صلحاء ہی کی قبریں ہیں۔

ان کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک زریں باب ختم ہو گیا، ۱۹۳۸ء میں مرحوم ندوۃ المصنفین کی تاسیس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ شریک تھے، سینتالیس برس تک برہان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، برعظیم کے علمی حلقوں میں ان کے اداریے کی بڑی قدر کی جاتی تھی، اور ان کی ذات گرامی کی وجہ سے ندوۃ المصنفین اور دارالعلوم دیوبند کا علمی وزن قائم تھا۔

مولانا اب جہاں پہنچ گئے ہیں، وہاں صرف ہماری دعائیں ہی ان کے کام آ سکتی ہیں، میرے خیال میں ان کی مغفرت کیلیے صدیق اکبرؓ اور عثمان ذوالنورینؓ جیسی بلند پایہ تصانیف ہی کافی ہیں۔

وہ آخری سانس تک فرائض شریعت کی ادائیگی میں کوشاں رہے، آخر وقت کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ گھر سے باہر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ گھر میں ہی بمشکل چلتے پھرتے تھے، اس کے باوجود نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کرتے تھے، میرے استفسار پر فرمایا کہ ان دنوں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء ملا کر نمازیں پڑھتا ہوں، امام ابن تیمیہؒ نے مریض کیلیے بھی مسافر کی طرح جمع صلوٰۃ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور اسی پر ان کا عمل [illegible]

آہ! حضرت مولانا شاہ امان اللہ پھلواروی

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ خبر نہایت غم والم سے سنی گئی کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ امان اللہؒ ۲۵ شعبان کو دن گذار کر شب جمعہ کو دو بجے عالم جاودانی کو سدھارے، ان کے خانمان، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پوری ریاست بہار، بلکہ اس سے باہر ان کے جاننے والے حلقوں میں غمناکی اور سوگواری کی جو کیفیت چھا گئی، اس کا صحیح اندازہ ہے، وہ ہزاروں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے ہوئے تھے، جو بھی ان سے ملا ان کی نیک نفسی اور پاک باطنی کا نقش اپنے دل پر بنا کر اٹھا، ان کے مریدین تو ان میں ان کے بزرگوں کے زہد و اتقاء کی ساری نشانیاں پاتے، خانقاہ مجیبیہ کی وجہ سے پھلواری شریف کی بڑی اہمیت ہو گئی ہے، یہ پٹنہ ہی کا ایک محلہ ہے، بہار شریف پہلے پٹنہ ہی ضلع میں تھا، اب نالندہ کا صدر مقام ہے، یہاں بڑے بڑے اولیائے کرام مدفون ہیں، ان کی روحوں کی برکتوں سے پوری ریاست کے مسلمان اب بھی سیراب ہو رہے ہیں، پھلواری شریف موجودہ دور کا بہار شریف بنتا جا رہا ہے، یہاں کے بزرگوں کی روحیں بھی بہار کے مسلمانوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی ضامن بنی ہوئی ہیں، انہی روحوں میں اب جناب مولانا شاہ امان اللہ کی روح شامل ہو گئی ہے، بہار کے لوگ معلوم نہیں ان کی کن کن باتوں کو یاد کر کے کب تک غمزدہ رہیں گے، یاد آتا ہے کہ تقریباً ۳۹ سال پہلے دارالمصنفین کے احاطہ میں ایک صاحب چکن کی شیروانی زیب تن کیے

ایک خوشنما ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتے پہنے اور جوانی نہیں بلکہ نوجوانی کی رعنائی بکھیرتے ہوئے داخل ہوئے، انکی آنکھیں نرگسی تو نہیں لیکن شرمگیں ضرور تھیں، چہرہ کا رنگ گوری چنبیلی کا سا تھا، اس سے درویشانہ جمال عیاں ہوتا تھا، وہ خراماں خراماں بلکہ معطر معطر بڑھتے چلے آرہے تھے، تو آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ حسن کا نور پیکر بن کر متحرک ہے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کا مسکن سامنے تھا، وہ اس کے برآمدہ میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک شخص نے کہا، یہی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ امان اللہ صاحب، اس وقت وہ سجادہ نشین نہیں ہوئے تھے، ہم لوگوں نے ان کی مخلصانہ تواضع کی، دامن دل ان کی طرف بہ صد کرشمہ و ناز کھنچتا چلا جا رہا تھا۔

ان کے خانوادہ سے دارالمصنفین والوں کا بڑا لگاؤ رہا، ہم سب کے استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح نے کچھ دنوں اپنی ابتدائی تعلیم اس خانقاہ میں حاصل کی، حضرت مولانا شاہ محی الدین رح کے زیر تربیت رہے، ان سے بعض کتابیں بھی پڑھیں، نجی صحبتوں میں ان کا جب ذکر آجاتا تو ان کا تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا کہ مجھے خانقاہ (خانقاہ مجیبیہ) میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی جو سعادت حاصل ہوئی مجھے اس نسبت پر فخر اور انھیں اس پر مسرت تھی، انھیں جب دیکھتا تھا عہد اول یاد آجاتا تھا اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر ہمیشہ کیلئے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا، (یادرفتگان ص ۳۴۸)

مولانا شاہ امان اللہ ان ہی کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ دارالمصنفین آئے تو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ہم لوگ ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے جیسے ایک خاندان کے لوگ ملا کرتے ہیں، وہ مل کر چلے گئے تو برابر خیال رہا کہ ان کے ساتھ اچھے لمحات گذرے، گو وہ ہم لوگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح نے مولانا شاہ محی الدین پھلواروی رح پر اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں یعنی خانقاہ مجیبیہ میں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آکر ملتے ہیں،

شروع سے اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں، یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں، دستار فضیلت اور خرقہ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر اترتے ہیں" (یادرفتگان ص ۳۹۳) مولانا شاہ امان اللہ میں بھی سارے اوصاف تھے، پھلواری شریف میں تعلیم پانے کے علاوہ اعظم گڈھ، فرنگی محل اور اجمیر شریف جاکر بھی تحصیل علم کی، سند حاصل کرنے کے بعد خانقاہ مجیبیہ کے مدرسہ میں درس بھی دیتے رہے، چار چار حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے، رسالہ "المجیب" میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے رہتے، اپنے حلقہ میں مذہبی استفسارات کے جوابات لکھا دیتے رہتے، دارالمصنفین سے علمی خط و کتابت برابر کرتے رہے، اس راقم کی حقیر تالیف بزم صوفیہ شایع ہوئی تو اس کو خاص طور سے منگوایا، اس میں حضرت جلال الدین جہانیان جہان گشت کے ملفوظات کے ایک مجموعہ سراج الہدایہ کا ذکر تھا، یہ غیر مطبوعہ ہے اسکو خاص طور سے نقل کرا کے اپنے لیے منگوایا۔

یہ راقم سنہ ۱۹۶۷ء میں ایک آپریشن کیلئے پٹنہ کے محلہ راجندر نگر کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا، جناب شاہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو پہلے اپنے صاحبزادہ کو بہت سے پھلوں کے ساتھ عیادت کیلئے بھیجا، پھر ان کے چچا اور خسر حضرت مولانا شاہ نظام الدین رح اور ان کے بعد محب مکرم مولانا شاہ عون احمد عیادت کیلئے تشریف لائے، اس عزت افزائی سے یقین ہوتا گیا کہ میرا آپریشن کامیاب ہوگا، اور واقعی رہا، خانقاہ مجیبیہ کے آداب میں ہے کہ اس کے سجادہ نشین معمولی ضرورتوں کیلئے باہر نہیں جاتے، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے خود تو قدم رنجہ نہیں فرمایا مگر اپنے عزیزوں کو بھیج کر ہر قسم کی کرم فرمائی اور عنایت گستری کرتے رہے، میرے لیے دعائیں بھی جاری رکھیں، یہ پیام بھی برابر پہونچاتا رہا کہ آپریشن کے بعد میری حاضری خانقاہ میں ضرور ہو، آپریشن کے بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملی تو قدم بوسی کے انتہائی جذبہ شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ان سے ملنے ملانے کے بڑے آداب و ضوابط ہیں، مگر انھوں نے فوراً اپنے حجرہ میں طلب کیا، جہاں ایک تخت پر مصلی رکھا ہوا تھا، فضا معطر ہو رہی تھی، چاروں طرف کتابوں کا انبار تھا، اندازہ ہوا،

کہ اس مصلیٰ اور ان کتابوں کے ساتھ تزکیۂ نفس اور طہارت طبع کیلئے معلوم نہیں کیا کیا منزلیں طے ہو چکی ہونگی اور اسی حجرہ میں ان کے بزرگوں نے انوار ایزدی کے سہارے حقیقت و معرفت کے کیا کیا جلوے نہ دیکھے ہوں گے، ان کے چہرے پر نظر پڑی تو ان میں پہلے سا جمال یوسفی نہ تھا، مگر عبادت کے تب و تاب اور ریاضت کی گرم نفسی سے ان کی داڑھی سے تقدس اور چہرے سے درویشانہ بزرگی کے پورے آثار عیاں تھے، وہ گذشتہ بیس ۲۰ سال سے اپنے والد بزرگوار کی مسند پر بیٹھ کر خاندانی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، اپنی عمر سے کچھ زیادہ معلوم ہوئے، شاید فغان نیم شبی اور آہ سحرگاہی کا اثر ہو، کچھ اونچا بھی سننے لگے تھے، ان کے پاس مودب ہو کر بیٹھنے پر مجبور تھا، باتیں شروع ہوئیں تو عرض کیا کہ بزم صوفیہ کے حقیر مصنف ہونے کے باوجود دل جاری نہ ہو سکا، جہاں پہلے تھا اب بھی وہی ہوں، آپ کی نظر کیمیا اثر کی بھیک مانگنے آیا ہوں، جو جواب ملا اس سے قلب میں تلاطم پیدا ہو گیا، فرمایا اس کی طلب فضول ہے، وہ اس گدی پر بیٹھا دیے گئے ہیں اس لیے بیٹھ گئے ہیں، ورنہ اپنے میں نظر کیمیا اثر کہاں، اب جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی محنت سے ہوتا ہے، گفتگو کچھ آگے بڑھی تو اپنے خانوادہ کا ایک درود شریف عطا کیا، فرمایا اس کو بلا ضرور روزانہ بلا ناغہ پڑھا جائے، یہاں تک کہ سوا لاکھ کی تعداد ہو جائے، تو شاید دل جاری ہو جائے، عرض کیا کہ دعا فرمائیں کہ اس درود کی توفیق ہو، گفتگو میں دیر ہو رہی تھی تو خادم نے خبر دی کہ دستر خوان لگا دیا گیا ہے، وہاں پہونچا تو یہ بہت پر تکلف تھا، پھلواری شریف کی مخصوص روٹیوں اور مٹھائیوں سے سجا تھا، کھانے کے بعد جناب مولانا شاہ نظام الدین اور جناب مولانا شاہ عون احمد سے مل کر رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی بہترین ساعتیں یہاں گذریں۔

پٹنہ جب جاتا تو خانقاہ مجیبیہ میں ضرور حاضری دیتا، اگر بے وقت پہونچتا تو حضرت شاہ صاحب اپنے حجرے میں طلب کر لیتے، وہ نماز با جماعت کے لیے حجرے سے نکلتے تو خدام اور حاضرین دو رویہ باادب کھڑے ہو جاتے، نقیب مسجد میں ان کی تشریف آوری

کی صدا دیتے، مسجد میں ان کی مخصوص جگہ بنی تھی، نماز باجماعت ادا کرتے، پھر حجرے میں واپس ہو جاتے، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک ایک مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ جاتے، تسبیح پڑھتے رہتے مریدین، معتقدین اور مستفیدین اس وقت رجوع کرتے، اور معلوم نہیں اپنے دل و دماغ کیلئے کیا تحفے اور سوغات لے جاتے، کبھی یہ عاجز عصر کے وقت پہونچ جاتا تو اسی مسجد میں ان سے فیض حاصل کرتا، بے تکلفی میں کچھ کہہ جاتا تو ہنس دیتے، جس سے ان کی پان سے آلودہ عقیقی رنگ کی بتیسی کھل جاتی، اس میں بھی ایک خاص کیفیت ہوتی۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ان کے چچا اور خسر جناب مولانا شاہ نظام الدینؒ کی وفات ہوئی، جس سے حضرت شاہ صاحب بہت متاثر تھے، ان کے متحرک نیوض و برکات سے پورا بہار فیض یاب ہو رہا تھا، درویشانہ اخلاق و صفات کے اعلیٰ نمونہ تھے، ان کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ جناب شاہ عون احمد کے بڑے لڑکے مولوی نصر احمد ندوی جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے، ان سے ہم لوگوں کا عزیزانہ تعلق اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ وہ دار المصنفین آکر یہاں تین ۳ سال تک رہے، اپنی کم عمری کے باوجود غیر معمولی علمی صلاحیت اور اچھی مضمون نگاری کا ثبوت دیا، معارف میں ان کا مضمون "امام الحرمین" پر شایع ہوا تو لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ کسی کمسن لڑکے کا لکھا ہوا ہے، اس کم عمری میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں لے لیا۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو راقم رفقائے دار المصنفین کے ساتھ ان کی تعزیت کے لیے خانقاہ مجیبیہ میں حاضر ہوا تھا، تو جناب مولانا شاہ عون احمد کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا، عصر کی نماز کے بعد اپنے مصلے پر فروکش تھے، ان کے پاس جا کر بیٹھا تو جب جب ان کی طرف نظر اٹھی، بنوع دیگر اٹھی،

کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

عزیزی نصر احمد کی جوانمرگی کا غم حضرت شاہ صاحبؒ کے دل سے ابھی دور نہ ہوا تھا کہ خود نہ صرف اپنے خاندان کے لوگوں بلکہ خدا جانے کتنے مداحوں اور عقیدت مندوں کو بسمل کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے، رحلت کے وقت ان کی عمر عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۶۴ سال تھی؛ ان کی ولادت مسعود ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔

ان کا حجرہ سونا ہوگیا، ان کے خدام ان کو حجرہ سے نکل کر مسجد میں آتے نہ دیکھ سکیں گے، ان کے متبعین اور خانقاہ کے زائرین عصر کی نماز کے بعد مسجد میں ایک مصلیٰ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اپنے دلوں کو سرور نہ پہونچا سکیں گے، بہار ایک پاکیزہ اخلاق رکھنے والے شیخ سے محروم ہوگیا، لیکن انھوں نے اپنی درویشانہ صفات کی بدولت اپنے خاندانی بزرگوں کی روایت، عزت اور وقار کو قائم رکھ کر اپنے خرقۂ طریقت کا وزن جس طرح قائم رکھا، اس کی یاد آئے گی اور اکثر آئے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے کوثر اور مغفرت کی تسنیم سے اعلیٰ علیین میں سیراب رکھے، اور ان کے غمزدہ اور سوگوار پسماندگان کو اپنی نصرت بیکراں سے سرفراز کرے۔ آمین۔ ثم آمین۔

باب التقریظ والانتقاد

قاموس الفاظ القرآن الکریم

ایک مبصر کے قلم سے

مرتبہ ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی : شائع کردہ دار الشروق جدہ، طبع اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

صفحات ۸۹۶ - قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ : دار الشروق، ص۔ب ۲۱۴۶۳، جدہ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ

قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کی کوششوں کا سلسلہ زمان ومکان کے مختلف احوال وظروف میں مختلف محرکات کے تحت، مختلف مناہج سے، مختلف سطحوں پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت آثار سے لے کر آج تک بلا انقطاع مسلسل جاری رہا ہے، اور آیندہ قیامت تک جاری رہے گا،

اسلام کی دعوت جب جزیرۃ العرب کے دائرہ میں محدود تھی، قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کے طریقے اور تقاضے بھی محدود تھے، وقت کے ساتھ جوں جوں یہ دعوت اقصائے عالم میں پھیلتی گئی اس کے سمجھنے سمجھانے کے طریقوں اور تقاضوں میں بھی وسعت، پھیلاؤ اور تنوع آتا گیا، رفتہ رفتہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں لکھنے کا رواج عام ہوا، اور یہ سلسلہ نہ صرف آج تک باقی ہے، بلکہ روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے، نت نئے ترجمے اور تفسیریں آئے دن

منظر عام پر آرہی ہیں، اور قرآنی علوم اور قرآنی ادب میں اضافہ ہورہا ہے، زیر نظر کتاب اسی اضافہ کی ایک عمدہ مثال ہے،

اس کے مؤلف ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے علمی ادارہ کے فارغ التحصیل ہیں، جس کا ایک شاندار ماضی، خوشنما حال اور روشن مستقبل ہے، اور جس کی علمی و دینی روایات اس کے فیض یافتہ کسی عالم کے حق میں شاہد عادل ہیں، ان جیسے عالم کے حسن نیت، فکر و نظر اور سلامت فکر کی ضمانت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی اٹھان ندوہ میں ہوئی ہے، اور ان کی سند فضیلت پر ندوہ کی مہر تصدیق ثبت ہے، مستزاد یہ کہ انھوں نے حرمین شریفین کے مقدس علمی مناہل سے بھی جرعہ کشی کی ہے، یہی نہیں، وہ آج کل مکہ معظمہ کی جامعہ ام القریٰ میں بحیثیت استاذ عربی درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، یہ ضخیم کتاب انھوں نے جامعہ ام القریٰ میں رہ کر لکھی ہے، اور اس کی طباعت بھی وہیں کے ایک ادارہ میں ہوئی ہے، جس کے باعث کتاب اپنے صوری محاسن کے اعتبار سے بھی جاذب نظر ہے، کاغذ اعلیٰ درجہ کا لگایا گیا ہے، طباعت جدید ترین خودکار مشینوں پر ہوئی ہے، اور جلد بندی میں جن تکلفات کا اہتمام کیا گیا ہے، اس نے کتاب کی ظاہری سج دھج کو ایسا دیدہ زیب اور دلفریب بنا دیا ہے کہ پہلی نظر پڑتے ہی اس کو اپنی ملکیت میں لینے کو جی چاہتا ہے، جلد کی نفاست خوش الوانی، نزاکت کے ساتھ مضبوطی کا حسین امتزاج پہلی نظر میں دامن دل کو کھینچتا ہے، ظاہری محاسن میں یورپ اور امریکہ کا اب تک جو بلند معیار رہا ہے، ان ممالک کے زیر اثر ہی آہی اس کے مظاہر اب مشرق میں بھی نظر آنے لگے ہیں، اور زیر تبصرہ قاموس اس کا عمدہ نمونہ ہے، مطبعہ دار الشروق اس کے لیے یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔

اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے عیاں ہے، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب ہے، اس کے ہر چھوٹے بڑے کلمہ کی، خواہ وہ اسم ہو، خواہ فعل یا حرف کے قبیل کے، اس کی لغوی تشریح

معنوی سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر محض عربی زبان دانی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کے فن کی متعلقہ امہات الکتب کے قدیم و جدید ماخذ سے مدد لے کر اس طرح کی گئی ہے کہ فی الجملہ قرآن میں مستعمل الفاظ کا ایک سیدھا سادہ مفہوم طالب علم کے سامنے آجائے، جس کے ذریعہ وہ ترجمہ یا تفسیر کی مدد کے بغیر بلا واسطہ براہ راست قرآن کو پڑھ کر اس کے مطالب کو سمجھنے کے قابل ہو جائے، اس کتاب کی زبان انگریزی ہے، یعنی قرآن مجید کے الفاظ کی لغوی اور معنوی تشریح انگریزی زبان میں اختصار سے کی گئی ہے، یہ قاموس خصوصیت سے ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو قرآن کو پڑھ کر سمجھنا چاہتے ہیں، مگر وہ عربی نہیں جانتے اور ان کی زبان انگریزی ہے، یا ان کی زبان انگریزی تو نہیں مگر ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی زبان سمجھنا ان کے لیے نسبۃً آسان ہے۔

قرآن مجید کو خود پڑھ کر سمجھنے کا رجحان روز افزوں ہے، دنیا کی چھوٹی زبانوں میں اس طرح کی کسی کتاب کی موجودگی اس کے دائرۂ استفادہ کو محدود کر دیتی ہے، فاضل مؤلف نے انگریزی کی عالمی اور بین الاقوامی حیثیت کو محسوس کر کے ہی اپنی اس کتاب کو انگریزی میں مرتب کیا ہے، ہم اس لحاظ سے اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ ایک مسلمان عالم نے تبلیغ دین اور اشاعت قرآن کے مشن کو سامنے رکھ کر علمی دنیا کی ایک اہم ضرورت کو علیٰ وجہ البصیرت پورا کرنے کی سعی کی ہے، اس طرح کی کاوشوں کا سلسلہ علمائے اسلام کی طرف سے جاری رہا تو ایک وقت آئے گا کہ انگریزی کے ذریعہ سے قرآن اور اسلام کے سمجھنے کے خواہاں طالب علم انگریزی کی ان کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے جو غیر مسلم اسکالروں نے اپنے منفی مقاصد کے لیے تحریر کی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں عربی لغات کے اصول و طریق کار کو اختیار کیا گیا ہے، جو ایک معروف و مروج طریقہ ہے، اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طریقے سے مانوس ہونے کے بعد طالب علم عربی لغات سے رجوع کرنے میں دقت محسوس نہیں کرے گا، فاضل مؤلف نے مبتدیوں کی ضرورت اور مبلغ علم کو

مدنظر رکھتے ہوئے مادہ، مصدر، مشتقات فعلیہ و اسمیہ کی مختلف شکلوں، رفع، نصب، جر کی مختلف حالتوں کو حتی الوسع یکجا کر دیا ہے، مصادر، ابواب، مشتقات اور صیغوں کی بدلی ہوئی شکلوں کی وجہ سے عربی میں بسا اوقات جو حیرانی ہوتی ہے اس کے لیے فاضل مؤلف نے کتاب کے آخر میں ایسے الفاظ کی ایک فہرست بطور ضمیمہ شامل کر دی ہے اور ان کے ساتھ ان کے اصل مادوں کو درج کر دیا ہے، تاکہ جہاں کسی لفظ کی تلاش میں اس کی بدلی ہوئی شکل کی وجہ سے دشواری ہو وہاں انڈکس کی مدد سے اس کو تلاش کر سکے، عربی قواعد کے مسائل کو بھی جابجا اشارات کی شکل میں بتانے کی طرف ضروری توجہ صرف کی گئی ہے، جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور قاری نہ صرف بسہولت اپنا مسئلہ حل کر سکتا ہے، بلکہ مزاولت، مشق و تمرین کے بعد عربی قواعد سے بھی وہ رفتہ رفتہ روشناس ہو کر اس قابل ہو جائے گا کہ براہ راست عربی گرامر کی درجہ بدرجہ اہم کتابوں کی طرف رجوع کر سکے، اہم مقامات اور شخصیات کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں قدرے تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے، اور کتاب کو مفید معلومات سے آراستہ کیا گیا ہے،

کتاب کی ترتیب میں فاضل مؤلف نے محض اپنی عربی دانی یا قرآن فہمی پر اعتماد نہیں کیا ہے بلکہ متعلقہ علوم کی اہم کتابوں اور مراجع سے استفادہ کر کے پہلے خود اطمینان حاصل کر لیا ہے، صحیح اور غلط، صواب اور خطا میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کے بعد اپنے نتائج کو درج کتاب کیا ہے' اس اعتبار سے اس کتاب میں تحقیق کا عنصر شامل ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ کسی کی نظر میں مؤلف کے اخذ کردہ نتائج یا بیان کردہ معانی صد فیصد صحیح نہ ہوں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی یہ کاوش ایک علمی کوشش ہے، اور اس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

فاضل مؤلف نے اس قاموس کی ترتیب و تالیف میں عربی اور انگریزی کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے اس کی فہرست بہت طویل ہے، ان کی اس طویل فہرست میں جہاں قدیم و جدید

مسلمان علماء کے نام بکثرت نظر آتے ہیں، مستشرقین کی بھی اچھی خاصی تعداد اس میں شامل ہے۔

مؤلف کے عربی مراجع میں چند معروف اور نمایاں نام یہ ہیں: ابن تیمیہؒ، ابن جریرؒ، ابن قیمؒ، ابن قتیبہؒ، ابن کثیرؒ، ابن منظور، بغوی، راغب، زمخشری، فراء، لغوی وغیرہ، انگریزی مراجع میں عبداللہ یوسف علی، آربری، محمد اسد، کارلائل، عبدالماجد دریابادی، مارماڈیوک پکتھال اور سیل کے نام قابل ذکر ہیں۔

قاموس الفاظ القرآن الکریم' لغات القرآن میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، وقت کی اہم ضرورت پورا کرنے میں مدد دے گی، قرآن مجید جو اس زمین پر اللہ کا آخری صحیفۂ ہدایت ہے' اس کا پیغام آفاقی اور ابدی ہے، اور امت مسلمہ اس کی حامل و امین ہے، اس حیثیت سے اس پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علمائے امت کو مختلف جہتوں میں ابھی کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے، اعدائے اسلام قرآن مجید کے پیغام کے متعلق شکوک و شبہات کی فضا پیدا کرنے کے لیے دن رات کوشاں ہیں، عصر حاضر میں ان کی طریق واردات بہت پرپیچ ہیں' علمی جہت سے قرآن کا دفاع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مثبت انداز سے ملت کے باشعور افراد اپنی مساعی کو بروئے کار لائیں۔

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اول

اس موضوع پر ۸۲ء کے سمینار کے بعد تالیفات کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے' جو بتدریج شایع ہوتی رہیں گی' یہ جلد ۸۲ء کے سمینار کی روداد پر مشتمل ہے، جس میں اس کی مختلف نشستوں میں جو مقالات پڑھے گئے ہیں' ان کا خلاصہ بھی دیدیا گیا ہے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،

مطبوعات جدیدہ

اُسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ عارفی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۵۳۶، قیمت بیس روپے، پتہ:- صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازہ نزد لسبیلہ چوک نشتر روڈ، کراچی

اردو میں سیرت و شمائل نبوی پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب میں زندگی کے مختلف امور و مسائل کے بارہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ اور طریقہ رہا ہے اس کی تفصیل و وضاحت کی گئی ہے، یہ کئی حصوں پر مشتمل ہے، شروع میں آپ کے محاسن اخلاق اور شمائل و عادات کے ضمن میں آپ کی بشریت، زہد و اتقاء، فقر اور مقام عبدیت وغیرہ کا تذکرہ بھی آگیا ہے، پھر مجلس، گھریلو زندگی، کھانے پینے، لباس و آرایش اور سفر وغیرہ کے بارہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات اور اسلامی آداب بیان کیے گئے ہیں، کتاب کے بڑے حصہ میں ایمان و عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور معاشرتی زندگی کے بارہ میں اسوۂ نبوی کی تفصیل پیش کی گئی ہے، ایک حصہ میں اس کا ذکر ہے کہ رات اور دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کون سی مسنون نماز ادا کیا کرتے تھے، آخر میں نکاح، نومولود، مریض کی عیادت اور میت کی تجہیز و تکفین وغیرہ کے سلسلہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات قلمبند کی گئی ہیں، لائق مصنف ایک صاحب دل اور حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں، اس لیے یہ کتاب بڑی موثر اور دلنشین ہے اور اس سے زندگی کے مختلف شعبوں کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور نمونۂ عمل سامنے

آجاتا ہے، جس کو اختیار کر کے ہر مسلمان فلاح دارین کا مستحق بن سکتا ہے، افادۂ عام کے لیے کتاب کا عربی اور انگریزی ایڈیشن بھی شایع کیا گیا ہے، اردو وہ بھی مذکورۂ بالا پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان :- از شیخ تاج الدین محمود بن خداداد اشنوی، تصحیح و تعلیق و مقدمہ از جناب نذر صابری صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، کل صفحات ۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ:- مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، کیمبل پور

شیخ تاج الدین محمود بن خداداد اشنوی چھٹی صدی ہجری کے متبحر علماء میں تھے، ان کی علمی یادگاروں میں یہ بیش قیمت فارسی رسالہ بھی تھا جس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وساطت سے جب یہ ڈاکٹر محمد اقبال کو ملا تو ان کا خاص مرکز توجہ بنا اور انھوں نے انگریزی میں اس کی تلخیص بھی کی، اور اس پر مبسوط عالمانہ تبصرہ بھی لکھا، اب یہ رسالہ مولانا محمد علی کھڈی (پاکستان) کے کتب خانہ سے جناب نذر صابری کو دستیاب ہوا، اور انھوں نے بعض نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد اسے شایع کیا ہے، رسالہ گو مختصر ہے، لیکن اس کی تین ۳ فصلوں میں توحید اور مکان و زمان کے موضوع پر بڑی علمی اور فلسفیانہ بحث و گفتگو کی گئی ہے، جو عام لوگوں کی فہم سے تو بالاتر ہے، تاہم جن لوگوں کو فلسفہ کا ذوق اور زیر نظر موضوع سے دلچسپی ہے، ان کے لیے یہ نہایت کارآمد ہے، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے سلیس و شگفتہ اردو میں ایک محققانہ مقدمہ ہے، اس میں رسالہ اور مصنف کے بارہ میں گوناگوں مفید معلومات کے علاوہ ان اغلاط کی تردید بھی کی گئی ہے جو دونوں کے تعلق سے مشہور ہو گئی ہیں، آخر میں رسالہ میں درج آیات قرآنی و احادیث نبوی کی تخریج اور اسماء و اعلام کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے، اس رسالہ کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے جس کے لیے مصنف تحسین کے مستحق ہیں۔